در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت
(گرامی)

اقبال

احمد دین

اِقبال

علامہ سر محمد اقبال کی اردو منظومات اُن کے مقصد شاعری

اور خیالات کے نشو و نما۔ مضامین کلام اور طرز بیان

پر

ایک نظر

از

مولوی احمد الدین صاحب بی اے ایڈووکیٹ لاہور

مؤلف "سرگذشت الفاظ"

سنہ ۱۹۲۶ء

بار اول (۱۰۰۰)

قیمت بلا محصول ڈاک [illegible]

تحفہ
نوجوان مسلم

رہزن ہمت ہوا ذوق تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو - گلشن میں آیا جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں



علامہ اقبالؒ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ (اقبالؒ)

کلامِ اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن مشاعرہ اور اقبال

انیسویں صدی عیسوی کا آخری عشرہ نصف سے زیادہ گذر چکا تھا۔ شہر لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ایک مشاعرہ کی طرح ڈالی گئی۔ مجلس مشاعرہ حکیم امین الدین صاحب بیرسٹر مرحوم کے مکان پر جو اسی خاندان حکیماں کے ایک نامور رکن تھے جن کے نام پر بازار مشہور ہے۔ منعقد ہوا کرتی تھی۔ میر مجلس اسی خاندان کے بزرگ حکیم شجاع الدین صاحب مرحوم تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دہلوی و سید ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرہ کی روح و روان تھے۔ دونوں حضرات خود بھی شعر کہہ کر لاتے تھے۔ اور اُن کے شاگردوں اور ثنا خوانوں کی ایک دوسرے کے مقابلہ میں طبع آزمائیاں مشاعرہ کی رونق دوبالا کرتی تھیں۔ دلی اور لکھنؤ کے اکھاڑے تھے۔ تماشائیوں کا ایک اچھا خاصا جمگھٹا ہوتا تھا۔ کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق میں چلے آتے تھے۔ اور سخندانی کی داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ ان نوجوان مشتاقان سخن میں اقبال بھی تھے۔ اقبال کے اشعار نے انہی دنوں میں اور اسی مجلس مشاعرہ میں لاہور والوں کی توجہ ان کی طرف دلائی۔ مرزا ارشد گورگانی مرحوم نے ذہن شعر کے اس ہونہار بِروے کے چکنے چکنے پات اس ایک شعر میں ہی

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تاڑ لیے۔ محبت اور قدردانی کی نگاہ سے دیکھا۔ اور عزت و توقیر کی سند پر جگہ دی۔ مقطع جو اس وقت اقبال نے پڑھا۔ دلّی اور لکھنؤ کے جھگڑوں پر اس کے خیالات کا اظہار عجیب انداز سے کر رہا ہے۔

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

حلقۂ احباب اقبال

اسی مکان کے سامنے جہاں مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ اس کے مالک حکیم شہباز دین مرحوم امین الدین صاحب کے چچا زاد بھائی اس میں رہتے تھے۔ آپ نہایت ہی دبلے پتلے آدمی تھے لیکن اللہ میاں نے اس مختصر سے جسم میں ایک ایسا دل رکھ دیا تھا۔ جو اسلامی اخوت اور محبت کے جوش سے ہر وقت لبریز رہتا تھا۔ خاطرداری اور مہمان نوازی اُن کا شیوہ اور خدمت اور ہمدردی ان کی جبلت تھی۔ اُن کے خصائل حسنہ نے ان کے مکان کو ایک کلب گھر بنا دیا تھا۔ شہر کے بامذاق اصحاب یہاں جمع ہوتے تھے حکیم صاحب کی چاہ اور چائے۔ اور اہل مجلس کی نکتہ سنجیاں قومی تحریکوں میں دلچسپی لینے والوں کو اس مکان پر کشاں کشاں لئے آتی تھیں اقبال نے جو یہ اشعار پڑھے حکیم صاحب اور ان کی جماعت نے فی الفور اپنے دائرہ اثر میں لے لیا۔ پھر کیا تھا۔ چند روز میں وہ بھی اس جماعت کے رکن بن گئے۔ اور حلقہ احباب نے جو اسی سلسلہ میں رفتہ رفتہ اقبال کی سحربیانی کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ اقبال کو لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کے لئے نظم لکھنے پر آمادہ کیا۔

دور اوّل:- انجمن نے جو مسلمانان پنجاب کی تعلیم کی کفیل ہو رہی ہے۔

انجمن حمایت اسلام اور دارالیتیم

لاوارث اور بےکس بچوں کی پرورش اور تربیت کے واسطے

ایک یتیم خانہ بھی کھولا ہوا ہے۔ اقبال کو جو موقعہ ملا۔ اس نے قوم کی حالت پر نوحہ خوانی "نالۂ یتیم" کی صورت میں کی۔ مسلمانوں کی بے کسی کے احساس نے یتیم کی حالت کس مپرسی میں ہمدردی محسوس کی۔ اور یتیم کی دکھ درد کی کہانی۔ خود اس کی زبانی۔ ایک دلخراش پیرایہ میں بیان کی گئی۔ یتیم کے نالے کیا تھے۔ قوم کا رونا تھا۔ بیکسی اور بے بسی کی یہ داستان سنکر کلیجہ منہ کو آتا ہے خود لکھنے والا بھی پریشان ہے۔ اور اطمینان قلب کے لئے کسی پاکیزہ توجہ کا خواہان اور منتظر۔ اس نے اک انوکھے انداز سے آستان یتیم ہاشمی سے نعتیہ لہجے میں استمداد چاہی۔

نظم قدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دل ناشاد کا
آ گرا ہوں تیرے در پہ وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیئے بدلہ مری افتاد کا
آنہ سکتا تھا زباں تک بیکسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

ہم نے استمداد کے انداز کو انوکھا کہا ہے۔ اور بلا شبہ ہمارا نوجوان شاعر قوم کی بے ہمتی۔ اور قومی اغراض سے اس کی بے اعتنائیاں خوب جانتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ

لذت رقص شعاع آفتاب صبحدم
یا صدائے نغمۂ مرغ سحر کی زیر و بم
رنگ کچھ شہر خموشاں میں جما سکتی نہیں
خفتگان کنج مرقد کو جگا سکتی نہیں

وہ خوب سمجھتا تھا۔ کہ مسلمان جو غفلت کی گہری نیند سو رہے ہیں۔ انہیں جگانے کے لئے۔ قومی کاموں میں دلچسپی لینے کے لئے۔ سخنے۔ قدمے۔ درمے شامل ہونے کے واسطے۔ انہیں ہوش میں لانے کے لئے۔ کوئی نرالی تجویز ہونی چاہیئے معمولی باتوں سے یہ بیدار ہوتے نظر نہیں آتے۔ اُن کے کانوں میں کوئی نئی بات۔ نئی آواز پڑنی چاہیئے۔ جو جادو کا اثر رکھے۔ انہیں بے تاب کر دے۔ اور خواب غفلت سے جگا دے۔ سحر آفریں شاعر نے وہ بات۔ وہ آواز۔ ان کے پیارے نبی صلعم کی طرف سے ان کے کانوں تک پہنچائی۔

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی
کہہ رہی ہے اہل دل سے ابتدا اسلام کی
ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی
تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہات ہے

انجمن کے اجلاس حاضرین اور سامعین کی کثرت کے لحاظ سے لاثانی ہُوا کرتے ہیں۔ لاہور جیسا بارونق اور بامذاق شہر۔ کالجوں اور مدرسوں کے طلبا کا ہجوم۔ عام لوگوں کا اژدہام۔ اجلاس میں مشہور واعظین فصیح و بلیغ لیکچرار۔ اور جادو بیان شاعروں کی شرکت۔ لوگوں کو شہر اور باہر سے کھینچے لئے آتی ہے۔ نظم کے ایک ایک شعر پر تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ روپوں کا مینہ برسنے لگا۔ آنسوؤں کے دریا بہ گئے۔ اور اس نظم کی ایک ایک کاپی (مطبوعہ) چار چار روپے کو بکی۔

نالۂ یتیم پہلی نظم تھی۔ جو اقبال نے ہزاروں کی تعداد کے ایک مجمع کثیر

ہیں بڑی حسنِ اتفاق ہے کہ اقبال جو اسلام اور اسلامیوں کا گرویدہ اور دلدادہ ہے۔ اپنی شاعرانہ زندگی کی ابتدا اس لئے کہ "نالۂ یتیم" جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں پہلی نظم تھی۔ جو اقبال نے ایک کثیر التعداد مجمع میں پڑھی) "نالۂ یتیم" سے ہی کرتا ہے۔ اور اس طرح اپنی قومی شاعری کی بنا قومیت اسلامی کی بناء سے ایک عجیب انداز سے وابستہ کر دیتا ہے۔

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بِنا اسلام کی

> ایک یتیم کا خطاب ہلال عید کو

دوسرے سال پھر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں "ایک یتیم کا خطاب ہلال عید کو" پڑھا گیا۔ اور اسی شوق اسی قدردانی سے سنا گیا۔ انجمن کے یتامٰے کی امداد میں یہ پہلی دو نظمیں لکھی گئی تھیں۔ لیکن شاعر کا مدعا ان سے کچھ اور بھی تھا۔ جیسا کہ وہ خود دوسری نظم میں یتیم کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔

اک بہانہ ہلال عید کا ہے
قوم کو حال دل سناتے ہیں
کس مزے کی ہے داستان اپنی
قوم سنتی ہے ہم سناتے ہیں

حقیقت یہی ہے۔ کہ اقبال نے ایسے ایسے بہانوں سے قوم کو حال دل سنایا۔ اپنی داستان۔ قوم کی داستان۔ درد کی زبان سے بیان کی۔ اور اس مزے سے بیان کی کہ قوم عش عش کرنے لگی۔ سننے والوں پر ساحرانہ اثر ہوا۔ فریفتہ ہو گئے۔ اور جب کبھی۔ جہاں کہیں۔ اقبال کا نام آیا۔ اسے سننے کے لئے دوڑے آتے ہیں۔ اور خود اقبال بھی نازاں ہیں۔ کہ

کس مزے کی ہے داستاں اپنی
تو ہم سُنتے ہیں ہم سناتے ہیں

ابر گہر بار
فریاد امت

اقبال کا درد بھرا دل اور ساحری فن زبان اپنی قوت کشش اور تاثیر سے واقف ہوگئے تھے۔ دیر تک خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ پھر جو موقعہ ملا۔ اسی مجلس حمایت اسلام میں ابر گہر بار کے نام سے ایک نظم پڑھی اقبال کے جذبات اور ولولے اپنا رنگ لا رہے تھے۔ قومی حالات نے جو حمایت اسلام کے اجلاسوں میں شریک ہونے سے نمایاں ہوتے اس کے دل میں نئے نئے جذبات پیدا کئے۔ نئے نئے ولولوں نے اس کے دل کو ابھارا۔ قومی مصائب۔ قومی زوال دیکھ کر درد دل بڑھا۔ اور اس کی شدت سے "عجز گویائی" کا طلسم ٹوٹ گیا۔ قید خامشی کی کڑیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں اور اقبال جو دو سال پہلے فرماتے تھے۔

نطق کر سکتا نہیں کیفیت غم کو عیاں
اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں انداز بیاں
آ نہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں
خندہ زن میرے لب گویا پہ ہے درد نہاں
عجز گویائی ہے گویا حکم قید خامشی
مجرم اظہار غم کو یہ سزا ملنے لگی

اب علی رؤس الاشہاد کہتے ہیں۔

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیونکر
ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو

ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائیگی

یہ مے کہنہ خم دل سے اچھل جائیگی

قوم کی طرف سے مایوسیاں جو اُسے ستاتی تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں باعث ہیجان ہوئیں۔ اخلاص اور عقیدت نے محبت نبوی میں امید کی جھلک دکھائی ... اور سوائے رسول کریمؐ کی جناب میں فریاد اور آپ کی استمداد کے کوئی چارہ نہ دیکھا۔ پکار اُٹھے۔

المدد اے سیدی مدنی العربی

دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

محض زبانی فدائیت نہیں۔ بلکہ دلی اور عملی فدائیت رسولؐ میں ہی قومی بہتری۔ قومی زندگی کی صورت نظر آئی۔ اقبال الفت نبوی کی کیفیت سے جو ان کے دل میں موجزن ہے۔ اور اس کے اثرات سے ہمیں راز دار بنانے میں کسی طرح گریز نہیں کرتے۔

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے

ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر

نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سرگشتہ جنت کو کیا اس پہ نثار

دشتِ یثرب میں اگر زیر قدم خار آیا

جوش سودائے محبت نبوی اور راست نبوی میں اقبال اپنے دلی جذبات اور ولولوں کو نہیں روک سکے۔ قوم کا رونا دل کھول کر رو دیا ہے۔ اور وہ لفظوں

کی نفس پرستی - فرقہ بندی تعصب - اور خانہ جنگی - امراء کی عیش پسندی - اور قومی اغراض سے بے توجہی پر صاف صاف الفاظ میں نکتہ چینیاں کی گئی ہیں - اور قوم و ملت کو جو اُن سے نقصانات پہنچ رہے ہیں بلا کم و کاست بیان کر دیئے گئے ہیں - سوز دل لفظ لفظ سے ٹپک رہا ہے -

فرقہ بندی سے کیا راہنماؤں نے خراب

ہائے! ان مالیوں نے باغ اجاڑا اپنا

ہم نے سورہ اخوت کی نکالی لیکن

نہ تو اپنا ہوا اپنا - نہ پرایا اپنا

بانگ درا میں نظمیں درج نہیں

یہ تینوں نظمیں "بانگ درا" میں جو علامہ اقبال نے شائع کی ہے - موجود نہیں - غالباً بعض اصطلاحی وجوہات شاعری - اور نظر ثانی کے لئے کم فرصتی کی بنا پر مجموعہ میں انہیں درج نہیں کیا گیا انہیں خیال کی وہ بلندی اور بندشوں کی وہ مسلسل لطافت اور چستی بھی نہیں جو بعد کی نظموں میں پائی جاتی ہے لیکن اس میں کلام نہیں کہ تاریخی اعتبار سے مجموعہ کلام اقبال میں یہ نظمیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں - جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی - اقبال کے اس سلسلہ منظومات میں جو اقبال کی شہرت کا باعث ہوئیں - منظومات جو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاسوں کے لئے لکھی گئیں - اور پڑھی گئیں - یہ تینوں نظمیں ایسی کڑیاں ہیں جو چھوڑی نہیں جا سکتیں - علاوہ ازیں ان نظموں میں شاعر کا میلان طبیعت بھی - اگرچہ سیدھے سادے الفاظ اور بندشیں ہیں پنہاں ہے - رسول عربی کا عشق اور قومی درد - ایک ایک شعر میں ساری ہے - اور یہی خصوصیت تاحال اقبال کی نظموں میں چاہے کسی رنگ میں ہوں - اپنا جلوہ دکھا رہی ہے - "ابر گہربار" میں جو "فریاد امت" کے نام سے بھی مشہور ہے

ذیل کے اشعار قابل توجہ ہیں۔

جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انسان ہوں میں

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں
رند کہتا ہے ولی مجھ کو۔ ولی رند مجھے
سُن کے ان دونوں کی تقریر کو حیران ہوں میں
زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں

صدی کی ایک چوتھائی کے قریب زمانہ گذر چکا ہے۔ اور اب بھی ان اشعار کی صداقت میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اور شاعر کا انتباہ۔

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں
مزرعہ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قرباں ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

ایک ایسی حقیقت ہے۔ جو چشم عدو کی نظروں سے بھی مخفی نہیں۔ یہ دل۔ اور یہ درد۔ کب۔ اور کس طرح پیدا ہوئے۔ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وطن اور گھرانا اقبال ۱۸۷۵ء میں شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ ایک

مردم خیز علاقہ ہے۔ اور ہندوستان کی سرحد پر ریاست جموں وکشمیر ہے اس کے دارالحکومت خاص شہر جموں کے حدود کے ساتھ جا ملتا ہے۔ آپ کے والد ایک صوفی منش فرشتہ صورت بزرگ ہیں۔ وہ کاشمیری الاصل ہیں۔ اور تا حال کاشمیری رنگ وروغن۔ ڈیل ڈول۔ اور اولیاء اللہ سے ارادت جو کشمیریوں کا خاصہ ہے۔ ان کے گھرانے کی خصوصیتیں ہیں۔ اقبال کی پرورش اور تربیت اسی گھرانے میں حسن عقیدت اور تصوف کے آغوش محبت میں ہوئی۔

مدرسہ اور کالج

ضروری تعلیم مدرسہ سے فارغ ہو کر اقبال سیالکوٹ کے مشن کالج میں گئے اور وہاں سے امتحان الیف۔ اے پاس کر کے زمانہ حال کی مروجہ تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے شہر لاہور میں آئے۔ اور یہاں کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ سیالکوٹ میں ان کی تعلیم ایک نکتہ سنج اور نہایت نہاد استاد شمس العلماء مولوی میر حسن صاحب کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی۔ استاد کی شفقت اور توجہ نے جو تاثیر پیدا کی۔ خود شاگرد کی زبان سے عیاں ہے۔

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہیگا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کلی میری آرزو کی کھلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

پروفیسر آرنلڈ اور اقبال۔

لاہور کالج میں اقبال کی طبیعت نے مضمون فلسفہ پسند کیا۔ ان دنوں یہاں پروفیسر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے۔ پروفیسر مذکور کسی زمانہ میں علی گڈھ کالج میں بھی رہ چکے تھے۔ ادبیات عربی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت پر ایک لاجواب کتاب لکھی ہے۔ اور انہیں مسلمانوں سے خاص اُنس تھا۔ اقبال جیسا بامذاق شاگرد جو مل گیا

استاد شاگرد کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ اٰپس میں ایسی دوستی ہوگئی جو تاحال قائم ہے۔ اس زمانہ کی یاد "نالۂ فراق" میں آرنالڈ کے ولایت چلے جانے پر اقبال کے خیالات ظاہر کرتی ہے۔

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
ابر رحمت دامن از گلزار من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

مذاق طبعی اور استاد کی خاص توجہ اور الفت نے اقبال کو فلسفی مسائل کا گرویدہ کر دیا۔ اور کالج میں اقبال نے مضمون فلسفہ میں خاص امتیاز حاصل کیا۔

تعلیم و تربیت کا اثر اور مذہبی جذبات۔

خاندان۔ مدرسہ۔ اور کالج کی تعلیم و تربیت کا اثر جیسا کہ واقعات مابعد نے ظاہر کیا۔ اقبال کے دل میں مذہبی جذبات کا پیدا کرنا اور ان کو ابھارنا تھا۔ جذبات جو اس کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ آرا ہونے ہیں۔ حسن و عشق تصوف کے اصل اصول ہیں۔ صوفیانہ مذاق کی آبیاری نے حسن و عشق کی کشت زار میں خوب گل کھلائے۔ اور فلسفہ جو اقبال نے لاہور گورنمنٹ کالج کی عالیشان درسگاہ میں پڑھا تھا۔ مذہب کے سایہ میں گوناگوں رنگ لایا۔

رسالہ مخزن اور اقبال

انہی دنوں میں خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب نے رسالہ مخزن جاری کیا۔ اور اقبال نے شیخ صاحب موصوف کی فرمائشوں پر گاہے ماہے اس کے لئے نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں شاعر کے دل کی تڑپ

اور خیال کی پرواز کا رخ نمایاں ہے حسن و عشق کی سحر آفرینیاں ہیں۔ بزم قدرت کی جلوہ آرائیاں ہیں۔ اور ترجمانِ حقیقت کی تلقین ہے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اس گلشن ہستی کے نظارے شاعر کی چشم بینا کے لئے حقائق کا ایک دبستان کھولے ہوئے ہیں۔ اور ان نظر فریب نظاروں میں فلسفی تجسس کی نگاہ حقیقت کے راز او تصوف کے اسرار دیکھتی ہے۔ اور جادو کی زبان سے بیان کرتی ہے۔

گل پژمردہ — گل پژمردہ کی افسردگی میں ہمارا فلسفی شاعر اپنے دل کے ویرانے کی تصویر اور اپنی زندگی کے خواب کی تعبیر دیکھتا ہے۔

گل رنگین — گل رنگین سامنے آجاتا ہے۔ تو اس کی سوز بانوں پر بھی خاموشی شاعر کو تڑپا دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اپنی پریشانیوں کو دیکھتا ہے۔ اور متحیر ہے کہ آرزو جو اس کی زندگی کا سوز و ساز ہے گل رنگین کے سلسلۂ حیات میں نظر نہیں آتی۔ اور ذوق آرزو جو اسے ہلکان کئے دیتا ہے پھول اس سے محض ناآشنا ہے۔ اس کی راز جو نگاہیں پھول کی لطیف اور رنگین زندگی میں نازک کلیوں۔ اور نفیس پتیوں کا سکون دیکھتی ہیں۔ اور حیران ہیں۔ کہ اس کا اپنا دردآشنا دل گلشن ہستی کی دوڑ دھوپ میں قدم قدم پر کانٹوں کی الجھنوں اور آبلہ آفرینیوں سے بے قرار ہے بمقابلہ مایوس کن ہے لیکن ان حالات میں بھی ہمارے شاعر کے لئے فلسفی تسکین عجب فرحت افزا ہے۔

یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو

رشکِ جامِ جم مرا آئینہ حیرت نہ ہو
یہ تلاش متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراک انسان کو خرام آموز ہے

تصوف کی تاثیر دیکھئے کہ بار بار دیکھنے اور غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ

تمیز لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل

اور اس لئے حق جوئی کا تقاضا ہو رہا ہے کہ

جہاں میں وانہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

حیاتِ انسانی اس معمورۂ ہستی میں بڑی بات جو انسان کو حیران کر رہی ہے اس کی اپنی زندگی کا مسئلہ ہے۔

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انسان
کہاں جاتا ہے، آیا ہے کہاں سے

کوہِ ہمالہ اور اس مسئلہ کے حل کرنے کی غرض سے شاعر کے تخیل کی بلند پروازیوں نے فصیلِ کشورِ ہندوستان، ہمالہ پہاڑ۔ کے کنجِ خلوت خانۂ قدرت میں انسان کی سیدھی سادی زندگی کی تلاش کی۔ اور اسی سلسلہ میں ابرِ کہسار، کی درافشانیوں میں پرندوں کے ترنم، اور غنچۂ گل کے ذوقِ تبسم کی ٹوہ لگائی۔

ستارہ صبح پہاڑ اور بادلوں پر ہی کیا منحصر تھا۔ ان سے بھی کہیں پرے ستارۂ صبح **آفتابِ صبح** کو زندگی کی بے ثباتی۔ اور محبت کی حیاتِ ابدی پر صبا پاشیاں کرتے دیکھا۔ اور پھر آفتابِ صبح جو نکلا۔ اس کی روشنی میں نظمِ قدرت کے راز دیکھنے کے لئے شناسائی فلک کی تمنا کی۔ تمنا نے ذوقِ جستجو بڑھایا۔ پھر **چاند** کیا تھا۔ راز منکشف ہونے لگے۔ دچاند چڑھا۔ تو اس میں بھی حیاتِ انسانی کا سوز و ساز نو نظر آیا۔ مگر نگاہ نکتہ رس تاڑ گئی اور حقیقت نے جہان زبان

بول اٹھی۔

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
درد جس پہلو میں اٹھتا ہو وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

"جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے" کہہ تو دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ ان فلک پیمائیوں نے شاعر کو زندگی کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے میں کوئی ایسی مدد نہ دی۔ زندگی کیا ہے اور اس کی پریشانیوں کی کیا اصلیت ہے۔ انسان کہاں جاتا ہے آیا ہے کہاں سے۔ ایسے سوالات تھے جو حل نہ ہو سکے۔

پروانہ اور بچہ

ان مایوسیوں میں آسمان کی سیر کا خیال چھوڑ کر گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ شمع کی روشنی نے عجب گل کھلائے۔ یہاں پروانہ اور بچہ شمع کے دلدادہ دیکھے۔ پروانہ کی جان نثاری حیران کر رہی تھی کہ

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

اس سے فلسفی متجسس نے پتہ لگایا کہ زندگی حقیقت میں لذتِ سوز و گداز کا نام ہے۔ مگر بچہ نے روشنی شمع میں "شوقِ نظر" اور ذوقِ طلب سے سوز و گداز کی کیفیت بھی نمایاں کر دی۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

اب اصلیت عیاں ہونے لگی۔

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں
یادِ وطن فسردگئ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

رازِ زندگی کی گتھی کچھ کچھ سلجھتی نظر آئی۔ اسی ادھیڑ بن میں گھر سے باہر جو نکلے۔ ذوقِ آگہی کی بیہمتگیوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب آسمان تک جانے اور اس کی شناسائی کی ضرورت نہ رہی۔ زمین پر ہی قدرت کے جلوے اور

تموجِ دریا

حقیقت کے بھید دکھائی دینے لگے۔ موجِ دریا کی بے تابیوں نے دعلینِ ہستی سے تڑپ بتایا۔ اور اس تڑپ کی گرہ خود موجِ مضطرب نے ہی اس نکتہ سے کھولنے کی کوشش کی۔

ہوں وفا رہروِ راہِ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگئ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

کنارِ راوی

اس تڑپ کی کشمکش میں کنارِ راوی نے سکوتِ شام میں اپنے سینہ کی کیفیت کا جلوہ دکھا کر راز افشا کر دیا کہ

جہازِ زندگئ آدمی رواں ہے یونہیں

ابد کے بحر میں پیدا ہو نہیں نہاں ہے ہو نہیں

اور۔

شکست سے کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

اس حقیقت آشنائی کی برکت سے خواب فراموشی سے جو سر اٹھایا تو تا حال یا بند حجاز آنکھ نے "بچہ اور شمع" کی بدولت محفل قدرت میں اک دریائے بے پایاں حسن دیکھا۔

شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

حسن کے اس طوفان میں۔ دل افروز نظارے تھے۔ اور حیرت آفریں مناظر۔ حسن کے نئے نئے کرشمے۔ اور ساحری فن انداز۔ دیکھ کر چشم ظاہر بین حیران تھی۔ اور مظاہر پرست دل حقیقت آشنائی کے جادوؤں پر فریفتہ اور قربان ہو رہا تھا۔ جگنو کی روشنی نے ظاہر کر دیا کہ

جگنو

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے۔ وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو

ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

بزم جہاں

شاعر کا گرم نیاز دل ان انکشافات میں حقیقت سے خبر پا کر کنج تنہائی میں جا بیٹھا۔ اور شاعر بزم قدرت کا پیامی بن کر ناز کرنے لگا۔ حسن کا ہم نشین عشق کا ہمراز۔ بن گیا۔ اب قدرت کی محفل کے راز اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اور گل و گلزار کی مجلس کے خاموش ناز و نیاز اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ چمن کا بسیرا۔ چمن والوں سے یگانگت۔ سبزہ کا فرش۔ شجر کا سایہ اور پھر اس کے لئے

لیٹنا زیر شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہے رہ رہ کے نظر

علم کے حیرت کدے میں یہ جلوے کہاں۔ یہاں حقیقت بے نقاب ہو کر اک نیا عالم آشکار کر دیتی ہے۔ اور گل کی پتی میں ہست و بود کا راز سربستہ کھول کر آنکھوں کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ شاعر کو اپنی اس حقیقت آشنائی پر ناز۔ اور اپنی اس عزلت گزینی پر فخر ہے۔ لیکن اس کا ناز نفس پرستی۔ اور خود ستائی کے لئے نہیں۔ اس عزلت سے بھی اسے دوسروں کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے اور اس حقیقت آشنائی سے بنی آدم کی بہبودی مدنظر۔ وہ خود ہمیں تلقین دلاتا ہے۔

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

شاعر کا دل اب شاہد قدرت کا آئینہ ہو رہا ہے۔ اور اس کی آنکھ خلوت سرا کے راز کے جادوؤں میں حیران ہے۔ خیال بلند ذوق جستجو میں فلک پیمائیاں کرتا ہے

خفتگان خاک سے استفسار

اور کبھی کبھی فکر شوق آگہی میں "خفتگان خاک" سے بھی

بھی استفسار کر لیتا ہے۔

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

حکمت کی ان الجھیڑوں سے جب کبھی ہمارے فلسفی شاعر کو فرصت ملتی ہے۔ تو بچوں کے لئے سیدھی سادھی میٹھی زبان میں چھوٹی چھوٹی اخلاقی کہانیاں دوسری زبانوں سے اخذ کرکے منظوم کر دیتا ہے۔

ایک مکڑا اور مکھی

ایک مکڑا اور مکھی

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندہ

عجب انداز سے بیان کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی خوشامد پسندی کے تباہ کن نتائج سے بھی آگاہ کیے دیتے ہیں۔

پہاڑ اور گلہری

"پہاڑ اور گلہری" کی گفتگو نادان اور مغرور انسان کو یاد کراتی ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

گائے اور بکری

گائے اور بکری احسان فراموشی کے عیوب بتاتی ہیں۔

ہمدردی

شاعر نے "ہمدردی" کی خوبی جگنو کی روشنی میں دکھائی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ماں کا خواب
بچے کی دعا

"ماں کا خواب"۔ رونے پیٹنے۔ اور ماتم کی برائیاں دکھاتا ہے۔ اور "بچے کی دعا" خدمت خلق اللہ کی تمنائیں۔

پرندے کی فریاد

"پرندے کی فریاد" بھی بچوں کے لئے ہی لکھی گئی ہے۔ اور کسی

دوسری زبان سے ماخوذ نہیں۔ اس کی خوبی اور لطافت بیان نہیں ہو سکتی۔ اس میں سوز و گداز دل ہلا دینے والا ہے۔ اور اس کی میٹھی میٹھی دردناک، دردانگیز سُریں بے تاب کئے دیتی ہیں۔ یہ نظم کیا بلحاظ سلاست زبان۔ اور کیا بلحاظ سوزِ بیان۔ اقبال کی بہترین منظومات میں سے ہے۔ اس میں ایک خاص اہمیت بھی ہے۔ آپ دیکھیں گے۔ کہ اس میں کچھ سیاسیات کی جھلک سی ہے۔ جھلک جواب سیاسیات کی طرف اقبال کے رجحان خیالات کا پیش خیمہ ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس غم کا اپنی دکھڑا کسے سناؤں

ڈر ہے یہیں قفس میں یہیں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھتے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

پروفیسر اقبال

اب اقبال پنجاب یونیورسٹی کا امتحان ایم۔ اے پاس کر چکے تھے۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی زبان انگریزی اور فلسفہ پڑھانے کی خدمت پر مامور ہو گئے تھے۔

آج تک تو اقبال کی لمبی نظمیں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں ہی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ پڑھی جاتی رہیں۔ اور ہم نے دیکھا ہے۔ کہ ان میں بھی قومی رنگ۔ قوم کے موجودہ عیوب و نقائص۔ اخلاقی اور معاشرتی۔ کے بیان سے زیادہ نہ تھا۔

محبت رسول اور الفت اسلام

ہاں ایک امر جو پہلے بھی نمایاں تھا۔ اور بعد میں بھی ویسا ہی بلکہ زیادہ نمایاں ہوا۔ اقبال کی محبت رسول عربی الفت اسلام اور دنیائے اسلام تھی۔ ابھی تک اقبال مدرسہ اور کالج کے حلقۂ اثر میں رہے تھے اور مدرسہ اور کالج کے باہر وسیع میدان میں انہیں مشاہدات و تجربات کا ایسا موقعہ نہ ملا تھا۔ ان کی شاعرانہ جدنگاہ اور ہمدردی کا دائرہ تا حال ہندوستان تک محدود تھے۔ اور یہاں بھی محض مسلمانوں کی پستی۔ اور اس پستی سے انہیں اُٹھانے کا علاج ایک محدود زاویۂ نظر سے دیکھے جا رہے تھے۔ ہم دیکھنے

ہیں، کہ ان نظموں میں سیاسیات کا کہیں اشارہ تک نہیں۔

آغاز سیاسیات امتداد زمانہ نے اقبال کو زندگی کی پیچ در پیچ راہوں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ دیا۔ اُس کے نشیب و فراز دکھائے۔ اور حالات حاضرہ کی روشنی میں ملک و ملت کی سیاسی پستی کے ڈراؤنے گڑھے دل ہلا دینے والے نظر آئے۔ ان حالات میں اقبال محبت بھرا دل رکھتے ہوئے سیاسیات سے دیر تک الگ نہیں رہ سکتے تھے۔

رسالہ مخزن میں چھوٹی چھوٹی قومی نظمیں لکھنی شروع کی گئیں۔ جن میں سیاسیات کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز اوّل ہی اوّل صدائے درد میں سنائی دی۔

صدائے درد ہندوستان میں پھوٹ کی گرم بازاری دیکھ کر شاعر بے قرار ہے۔ اور ایسے خزاں تاثیر گلستان میں قیام کرنا۔ اسے ناممکن نظر آتا ہے۔ یہاں باہمی بغض و عناد کی ویران کاریاں۔ اور قرب فراق آمیز کی بربادیاں کو دن دیکھے۔ صدائے درد سے نالاں ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

ادھر تو قوم کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے دل میں ولولے بھرے پڑے ہیں اور زبان معجزہ بیان اپنے جوہر دکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ اور ادھر قوم کے نزاعات باہمی کی بس بھری ہوا سے زبان خشک اور دل پژمردہ ہوا ہے ہیں۔ سوائے افسوس کے چارہ نہیں۔ اور سوائے حسرت کے کوئی صورت نہیں۔

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

شاعر حالات حاضرہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اور مجلس کی بے اعتنائی اُس کی

حوصلہ مندیوں کو پست کر دیتی ہے۔ پریشان ہے۔ ایسے حالات میں کون شعر کہے۔ کیا کہے۔ سوز کہاں۔ اور نغمہ پیرائی کیسی۔

حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو

وہ دیکھتا ہے۔ کہ ہندو مسلمان ہیں۔ کہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ دن رات ملتے جلتے ہیں لین دین کرتے ہیں۔ شادی غمی میں ایک دوسرے کے شریک حال بھی ہوتے ہیں۔ اور پھر بھی ایک دوسرے سے گریزاں ہیں۔ جاتے ہیں۔ اور ملنے ملنے میں ایک دوسرے کو رگڑ دیتے ہیں۔ یہ قرب کیسا۔ اور یہ اختلاط کیسا۔

لذّت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

شاعر نے جو قرب حقیقی کا متمنی ہے۔ اور موج و ساحل کے اختلاط سے گھبراتا ہے۔ ہندوستان کی ایسی نفاق انگیز سرزمیں سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اور اہل وطن کو شرم دلا کر بتایا۔ کہ اس اخوت ناآشنا ملک میں اقامت کرنے سے۔ غیرت والوں کے لئے۔ گنگا میں ڈوب مرنا بدرجہا بہتر ہوگا۔ کون سُنتا تھا۔ اور کون سمجھتا تھا۔

ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر شاعر کا نازک دل گنگا کے موجۂ ناظم سے گھبرایا۔ اور دامن ہمالہ میں اس نے کنج عافیت دیکھا۔ اور ایک چھوٹے سے جھونپڑے کی آرزو میں مست ہو گئے۔

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گذاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
راتوں کے چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید اُن کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
میں اُس کا ہمنوا ہوں۔ وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احسان
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو۔ نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

آرزو کیا ہے۔ اک دردمند دل کی شکست کی آواز ہے۔ ناکامیوں کی آہیں ہیں۔ اور مایوسیوں کے نالے۔ فکر سے آزادی اور عزلت کی خواہش تو ہے۔ مگر یہاں بھی قوم پرستی کا چسکا نہیں چھوٹتا۔ جھونپڑے کی آرزو ہے۔ دیر و حرم کی

حافظہ بنار یوں سے بے نیازی کی ہوس ہے لیکن قوم کے گمرہوں کو راہ راست پر لانے کی تمنّا ساتھ ساتھ ہے۔ قوم سے بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے ارادے بھی ویسے ہی ہیں۔

رانوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید اُن کی میرا ٹوٹا ہوًا دیا ہو
بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسمان پہ ہر سو بادل گھرا ہوًا ہو

شاید قوم کے بھولے بھٹکے۔ تھکے ماندے۔ چاروں طرف سے تاریکیوں میں گھرے ہوئے اندھیری رات میں حیران و پریشان بجلی کی چمک سے شاعر کی کٹیا کو دیکھ کر اس کے ٹوٹے ہوئے دئے کی ٹمٹماتی روشنی کی رہنمائی میں آگے بڑھیں۔ اور اس تنہائی کی خاموشی میں اس کے نالے دردمند دلوں کو رلا دینے کی تاثیر پیدا کریں۔ اور اس کا رونا۔

بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

کنج تنہائی مناظر قدرت کے اس دلفریب گوشے میں جو شاعر کے تخیل نے اپنی نغمہ ریزیوں کے لئے انتخاب کیا۔ کنار عافیت کی تلاش محض ایک آرزو تھی۔ جو اقبال کی عزلت گزین طبیعت بھی پوری نہ کر سکی۔ دنیا کی محفلوں کو اس طرح چھوڑ جانے کی ہمت کس میں تھی۔ اور پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر آنسو کون بہاتا۔ اور خدا جانے ان کی تاثیر بھی کیا ہوتی۔ ہاں! دنیا اور دنیا والوں سے الگ تھلگ گھر میں بیٹھ گئے۔ اقبال طبعاً تنہائی پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور میدان عمل میں دوسروں کے لئے چاہے ان کی تلقین کچھ ہی ہو۔ ان کا اپنا مسلک مدت العمر یہی رہا ہے۔ کہ اپنے کنج تنہائی میں خاموش بیٹھے ہیں۔ دنیا کی محفلوں اور مجلسوں سے بیزار۔

شورش سے گریزاں۔ سینہ میں دل ہے کہ قومی درد سے بے تاب ہے! اور دل میں جذبات ہیں۔ کہ اندر ہی اندر ایک ہنگامہ بپا کئے ہوئے ہیں۔ دل بھر آیا تو آنسوؤں کی شبنم افشانی ایک طوفان لے آتی ہے۔ اور نالوں کی سریلی صدائیں مُردوں میں جان ڈال کر حالت وجد پیدا کر دیتی ہے۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

تصویر درد مارچ ۱۹۰۴ء میں ملکی جذبات کی بہترین نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تصویر درد کے نام سے پڑھی گئی۔ ہندوستان میں وطن پرستی پر اس سے بڑھ کر نظم نہیں لکھی گئی۔ اور ہندو مسلم اتحاد پر اس سے بہتر بھی اور کہیں نہیں کہا گیا۔ تصویر کیا بلحاظ صورت گری۔ اور کیا بلحاظ رنگ آمیزی ادبیات اردو میں بے عدیل ہے۔

درد اس کا موضوع ہے۔ درد نے لکھوائی۔ درد سے لکھی گئی۔ پڑھو۔ سنو۔ اور پڑھ کے چھوڑ دو۔ درد ہی درد ہے۔

اپنی حسرت بھری داستان۔ عرصہ عالم میں اپنی ہستی کی اہمیت انکشاف حقیقت دنیا و مافیہا۔ راز دانی قضا و تفسیر استقبال۔ ہندوستان میں امتیاز ملت و آئین۔ اور اس کے نتائج اور ان نتائج کو روکنے کے ارادے۔ توحید مطلق محبت۔ ذوق طاب ہمت۔ تمنائے رفعت۔ خودی اور خودداری پر دل کھول کر طبع آزمائی کی ہے اور سخن آفرینی کی بدرجہ اتم داد دی ہے۔

ابتدا میں یہی بتایا گیا ہے کہ یہ داستان غم ایسی دردناک ہے۔ کہ کسی کو اس کے سننے کی تاب نہیں ہو سکتی۔ اور وفور رنج والم سے کہنے والے میں بھی یارائے گفتگو نہیں۔ اس کی زبان بند ہو رہی ہے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ یہی بے زبانی درد دل کی کہانی بیان

کر رہی ہے۔ اور لوگوں میں اس کہانی کے چرچے بھی ہو رہے ہیں۔

اقبال کے نزدیک زندگی کا لطف اسی میں ہے۔ کہ یہ زندگی حیات جاودان حاصل کرنے میں صرف ہو۔ ورنہ ایسی زندگی سے تو پھر موت ہی بہتر ہے۔

الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیات جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری

لیکن ہم ہندوستان والے اس اصول پر عمل پیرا نہیں اور اقبال کو بھی یہی بات کہ ہم اس پر عمل پیرا نہیں ستا رہی ہے۔ اور اسے اسی کا رونا ہے۔ رونا شخصی نہیں، ساری قوم کا رونا ہے۔ اور شاعر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بھی اپنے فرض منصبی کی ادائگی سے غافل نہیں۔

اسی داستان غم کے سلسلہ میں تصویر درد کے دوسرے بند میں اپنی، قوم کی حسرت اور حرمان نصیبی کے تذکرے ہیں۔ اور بگڑی ہوئی تقدیر کا رونا ہے۔ مگر اس بے بسی اور ناسزاواری کے طغیان میں بھی شاعر ہمیں ہستئ انسان کی حقیقت سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔

نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس مے خانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

اور شاعر کا دعوےٰ ہے کہ

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

بند سوم کے پہلے دو اشعار میں شاعری کی اسی ممتاز خصوصیت کا تکرار ہے جو قصہ کے راز داں ہونے پر نازاں ہے۔ اور پھر اصل کہانی۔ وہی دکھ درد کی کہانی۔

جو سُنی نہیں جاسکتی۔ بیان نہیں ہوسکتی۔ شروع کردی گئی ہے محبّت وطن نے شاعر کی زبان میں جو وفورِ غم واندوہ سے بند تھی۔ روانی پیدا کردی ہے۔ اشعار کیا ہیں۔ ہندوستان کے عبرت خیز فسانے، پُر نوحہ خوانیاں ہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے۔ کہ ساری مصیبت۔ ساری ویرانی۔ اپنی کرتوتوں کی کمائی ہے۔ جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے۔ اپنے ہی اعمال کی شامت ہے۔ ابنائے وطن کی رزم آرائیاں۔ اور پیر فلک کی ستم آزمائیاں شاعر نے جو دیکھیں۔ درد انگیز اور معنے خیز اشتباہ سے قوم کو بیدار ہونے کے لئے کہا۔ بیداری کی اہمیت ظاہر کرنے کی غرض سے باہمی تنازعات اور خوابِ غفلت کے تباہ کن اثرات پر بار بار زور دیا ہے۔ اور پرانے جھگڑے۔ دیرینہ قصّے محمود اور سومنات کی داستانیں۔ اورنگ زیب اور سیواجی کی کہانیاں بھول جانے کا مشورہ دیا ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

اور سکون و سکوت کے نتائج سے جو ایشیائی قوموں کا خاصہ ہو رہا ہے ڈراتے ہوئے اہلِ وطن کو پیغامِ عمل دیا ہے۔

یہ خاموشی کہاں تک لذّتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تُو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے

جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

شاعر سودائے محبّت وطن سے سرشار۔ غم و غصّہ سے پریشان۔ اور وطن اور ابنائے وطن کی مایوس کن حالت پر نالاں محفل میں سوز اور درد دل پیدا کرنے کا تہیہ کرتا ہے۔ اور اپنی ترنم ریزیوں سے قوم و ملک میں اتحاد و اتفاق کا سلسلہ قائم کرنے پر مستعد سرگرم نظر آتا ہے۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

اور پھر اپنی حقیقت آشنائی کے بل پر ہندوستان والوں کو متنبہ کرتا ہے۔

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

اس حقیقت آشنائی کی طاقت کا راز کس خوبی سے عیاں کر دیا ہے۔

جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

اسی سلسلے میں اقبال نے اپنے مسئلہ خودی اور پیغام عمل کو بھی جو بعد میں اس کی سخن سنجی کے اہم ترین مضامین ہو گئے ہیں۔ چھیڑا ہے۔ اور ابنائے وطن کے ذوق افتادگی۔ سکون۔ ضعف ایمان۔ تنگ نظری۔ تعصب اور کج بینی کو ایک نئے انداز سے بیان کیا ہے۔ اور سمجھایا ہے۔ کہ اقوام عالم میں عزت و ناموس قائم رکھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوستان والے بھی ہندو اور مسلمان آنکھیں کھولیں۔ چشم بینا سے حقیقت کا ملاحظہ کریں۔ فرقہ آرائیاں چھوڑیں۔ تعصب سے کنارہ کش

ہوں محبّت سے سرشار ہوں۔ بلند خیالی اور علو ہمتی اپنا شعار بنائیں۔ اور تمنّائے رفعت کے پروں پر اڑتے ہوئے۔ غیر قوموں کے سہارے سے بے نیاز۔ زندگی کے مدارج اعلیٰ طے کرنے کی کوشش میں سرگرم ہو جائیں۔

ہمیں بتایا گیا ہے۔ کہ حقیقی آزادی ترک آرزو میں ہے۔ آرزو جو ہمیں محض تن آسانیوں کا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ اور جو حرص و ہوا کے معروف ناموں سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ انسان جو بندہ حرص و ہوا بن کر در بدر پھرتا ہے۔ اور اس کی بدولت اغیار کے منت و احسان کا جوا گلے میں ڈالے ہوئے خوش نظر آتا ہے۔ آزادی حقیقی آزادی سے محروم ہے۔ آزادی کا اصل اصول استغنا ہے۔ اور اگر استغنا نہیں۔ تو آزادی مفقود اور غلامی متیقن ہے۔ اور اس بنا پر شاعر کا مشورہ ہے۔

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثل حباب آب جو رہنا

اور کسی کا محتاج ہو کر رہنا۔ بے آبرو رہنا۔ تو کسی حالت میں بھی نفیس ترین سازو سامان کی موجودگی میں بھی۔ دلپذیر نہیں۔

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

ایک اور امر جو آزادی کی جڑ ہے محبّت ہے۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

کون ہے جو اس سے انکار کر سکتا ہے۔ کہ دنیا میں امتیازات نسل۔ رنگ۔ اور ملک نے۔ حضرت انسان کو ایک دوسرے کا حاکم و محکوم بنایا ہوا ہے۔ یہی امتیازات ہیں۔ جو قوموں کو آزادی سے محروم کرنے کے ذمہ وار ہو رہے ہیں۔ اگر نوع انسان کی

محبّت۔ انسان کے دل میں جلوہ گر ہو جائے۔ اور ہم ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھنے لگیں۔ تو ساری دقتیں رفع ہو جاتی ہیں۔ سارے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

ہمارا وطن پرست شاعر اُنہا ئے وطن کو بتاتا ہے۔

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو
مرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

اور اگر ہے تو

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو! رہنا

یہ نظم محض ملکی نقطہ نگاہ سے لکھی گئی تھی۔ اس میں امتیاز ملت و آئین کو معیوب و مطعون ٹھہرایا ہے۔ وطن اور وطن پرستی اس کے موضوع۔ اور فرقہ آرائی کو اس میں مذموم قرار دیا گیا ہے۔ خیالات کی بلند پروازی۔ اور کلام کی فسوں کاری کے لحاظ سے یہ نظم وطن پرست ادبیات ہند میں لاجواب ہے۔

نیا شوالہ نیا شوالہ بھی انہی ایام کا لکھا ہوا ہے۔ اور وطنیت اور ہندو مسلم اتحاد پر ایک بے مثال جدت طرازی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو مسلمان دن رات مذہب کی آڑ میں ایک دوسرے سے الجھنے کو تیار رہتے ہیں۔ ویدک دھرم اور اسلام کا نام لیکر۔ دین اور بزرگان دین کی توہین میں مصروف ہیں۔ ناقوس و اذان کی صداؤں سے ملک میں شورش مچا رہے ہیں۔ اور پیپل اور علم کی سرفرازیوں کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہیں۔

یہ واقعات ایسے نہیں کہ ایک سچا وطن پرست دل۔ اخلاص و محبّت کی نگاہ سے دیکھے۔ اور خاموش رہے۔ ہمدردی اور صداقت کی زبان سے بولے اور بیزاری کا اظہار نہ کرے۔ اقبال کی نکتہ رس نظر چوتھائی صدی پہلے ہی ابنائے وطن کی باہمی بدسلوکیاں۔ اور بدعنوانیاں مستقبل کی پردگی میں اسی تفصیل سے دیکھ رہی تھی جو آج عالم شہود میں نمایاں ہو رہی ہیں۔ اور اقبال ان نظاروں پر جو عامیانہ آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ دردمند دل کی ناراضگی کھلے لفظوں میں بیان کرنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔

سچ کہدوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

ملک کی بہبودی۔ ہندو مسلمان کی بہتری مستقاضی ہے کہ یہ جھگڑے۔ یہ تنازعے۔ مٹ جائیں۔ اور ان جھگڑوں۔ ان تنازعوں کے مٹانے کا نسخہ صرف باہمی محبّت اور اختلاط ہی ہے۔ دلی الفت۔ دلی اتحاد۔ باہمی اعتماد۔ ایک دوسرے پر اعتبار۔ اصل اصول ہیں۔ جب تک یہ پیدا نہ ہو کوئی صورت ملنے کی نہیں۔ اتفاق پر تقریریں۔ اتحاد پر تحریریں سطحی باتیں ہیں معاہدات و میثاقات فروعی امور ہیں۔ اقبال ہمیں بتا چکے ہیں۔ اور صریح الفاظ میں واضح کر چکے ہیں۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

ضرورت ہے۔ دل کے دیس میں محبت کا مندر بنانے کی۔ اخوت کا معبد قائم کرنے کی۔ جہاں پجاری محبت کی دیوی کے شیدائی ہوں۔ اخوت کے نشہ میں سرشار ہوں۔ کیونکہ

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

صاف ظاہر ہے۔ کہ نیا شوالہ چمنستان ہند میں بنانے کی تجویز درد دل سے پیدا ہوئی تھی۔ اور ایک بید دھڑک سچی زبان سے نکلی تھی۔ لیکن چمن کے مالی۔ برہمن۔ نے جسے ان دنوں صراحتاً مخاطب کرکے کہا گیا تھا۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بیں بھری ہوا نے

کچھ توجہ نہ کی۔ اور یہ آرزو۔ یہ تجویز۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

تا حال اتمام کی ویسی ہی محتاج نظر آتی ہے جیسے ایک چوتھائی صدی پہلے تھی۔

ترانۂ ہندی

'ترانہ ہندی' بھی اسی سلسلہ کی ایک چھوٹی سی نظم ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ترانہ کی جان ہے۔ اور ہندیوں۔ ہندو مسلمانوں۔ کے شبانہ روز ورد کے شایاں۔ زریں اصول جو ہندوستاں کی آزادی۔ ہندوستان کی زندگی کی بنیاد ہے۔

ترانہ ہند ۱۹۰۴ء کے آخیر میں لکھا گیا تھا سادہ الفاظ اور موثر پیرایہ میں اقبال نے کہا۔ اور ہندوستان میں گھر گھر اور بچے بچے کی زبان پر رواں ہو گیا۔ پڑھئے اور دیکھئے بس کہ وطنیت ہند کے تاثرات کیا ہی روح افزا۔ اور دل بڑھانے والا انداز اختیار کیا ہے۔

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اگرچہ ترانہ شروع سے لیکر آخیر تک وطنیت کی لے سے ہندوستانی دلوں کے اُبھارنے میں بلاتمیز مذہب وملت لوا پیرا ہے لیکن

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہے یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

ایک اسلامی دل کی خصوصی تڑپ کا شاہد ہے۔

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

انہی دنوں ہندوستانی اور ملی رنگ نے اقبال کے قلم سے ایک نظم لکھوائی جو اپنی طرز میں لاثانی ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا ...

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوح نبی کا آ کر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ترانہ ہندی تو ہندو اور مسلمان یکساں پڑھتے اور گاتے ہیں

لیکن یہ نظم اگرچہ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت زیب سر کئے ہوئے ہے۔ اور رسے وطنیت سے لبریز ہے۔ برادران وطن اس سے مانوس نہیں ہوسکے۔

دوراول پراجمالی نظر

پیشتر اس کے کہ ہم آگے بڑھیں۔ اس دور کی نظموں پر ایک اجمالی نظر ہمیں بتادیگی۔ کہ اقبال کی شاعری کے ان ابتدائی مراحل پر غزلیات ہیں حسن کی شوخیاں عشق کی گرمیاں۔ ادھر نیاز۔ اُدھر ناز۔ اسی پرانی طرز میں جلوہ آرا ہیں۔ مگر ساتھ ہی کہاں کہیں تصوف کی رنگ آمیزی۔ اور کبھی کبھی حکمت کی صورت گری نے حسن وعشق کا مرقع ایسا دلکش بنادیا ہے کہ استعجاب کی آنکھ حیران رہ جاتی ہے۔ حکمت اور تصوف کے اثرات دوسری نظموں میں بدرجہ اولیٰ نمایاں ہیں۔

ایک طرف تو تصوف کی جھلکیاں اسرار عالم دکھا رہی ہیں۔

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

اور دوسری طرف حکمت کی جستجو گرم تقاضا نظر آتی ہے۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

ذوق استفسار کا تفحص زمین وآسمان پر تگ ودو میں مصروف ہے۔ اور راز ہستی کے انکشاف میں حیران وسرگردان۔ حکمت کی گتھی اور تصوف کے مسائل استفہام کی پریشانیوں میں ژولیدگی کے آثار دکھا رہے ہیں۔

خفتگان خاک سے بھی سلسلۂ گفتگو ہلا کر اس عقدۂ مشکل راز ہستی۔ کے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور مظاہرات قدرت سے ہمکلام ہوکر حقیقت عالم سے آگہی حاصل کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔

لیکن شاعر کے اپنے جذبات میں ابھی وہ کشش نہیں - اس کے اپنے دل میں ابھی وہ کیفیت وجدان نہیں جو اسے بزم قدرت کا رازدار کر دے - جو اسے اسرار ہستی کا محرم بنا لے - اس کی آنکھ ابھی پابند مجاز ہے - اور اس کا دل ابھی گرم نیاز -

ہمالہ کی چوٹیاں ثریا سے سرگرم سخن ہیں لیکن اسے اپنا ہمراز بنانے سے پرہیز کرتی معلوم دیتی ہیں - ابر کہسار فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے - گر اسے اپنے ساتھ طرب اندوز کرنے میں متامل ہے - ہمالہ پر پھول کی کلی نشۂ ہستی میں موج نسیم کا گہوارہ بنائے جھول رہی ہے لیکن خاموش ہے - اور ہاتھا پائی کے ڈر سے اس کے قرب سے محترز - ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی آ رہی ہے - اور اگرچہ شاعر اسے یقین دلاتا ہے کہ "دل سمجھتا ہے تری آواز کو" - وہ اسے ہمدم و ہمساز نہیں بناتی - گل رنگین کو ہر چند سمجھایا گیا ہے - کہ

تو شناسائے خراش عقدۂ مشکل نہیں

تو ڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں
یہ نظر غیر از نگاہ چشم صورت بیں نہیں
آہ! یہ دست جفا جو اے گل رنگیں نہیں
کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں
کام مجھ کو دیدۂ حکمت کی الجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

اور اس اقرار محبت سے گل رنگین کے دل میں اعتماد پیدا کر کے اس کی زندگانی کے بے گداز آرزو ہونے کا راز دریافت کرنا چاہتا ہے لیکن پھول سوز بانوں پر بھی خاموش ہے اور وہ راز جو اس کے سینہ میں مستور ہے ظاہر نہیں کرتا -

محفل قدرت کی اس بے اعتنائی پر شاعر نے درد دل کا اظہار کیا ہے -

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز سیہ بخت سیہ کار ہوں میں

مگر اس کے ذوق جستجو کی ان تلخ ناکامیوں پر بزم قدرت ترحم ہو کر قدرے مائل ہونے لگی ہے۔ اور اس کے پیہم استفسار و استفہام پر اسے بتایا گیا ہے کہ اس کی سیہ روزی کی وجہ کیا ہے۔ مظاہرات قدرت اس کے ساتھ راز کی بات کرنے سے کیوں اجتناب کرتے ہیں۔ اور اسے اپنی سعی میں کامیابی کن صورتوں میں حاصل ہو سکتی ہے۔

آہ! اے راز عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دام تمنا میں الجھنے والے
ہائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابند مجاز
نازیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرم نیاز
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

ہم نے دیکھا ہے کہ ابتدا میں مشاہدات قدرت شاعر کے استفسار پر خاموش رہے ہیں اس کے سوالات کا جواب اُدھر سے شاذ ہی ملتا ہے۔ اور جو ملتا ہے۔ وہ بھی نامکمل حقائق سے آگہی جو مقصد شاعر ہے میسر نہیں۔ اور اطمینان قلب جو حقیقت آشنائی سے مطلوب ہے اسے حاصل نہیں۔

ان ناکامیوں پر بھی قدرت کا شیدائی اور حقیقت کا طالب مایوس نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی سعی ضرور مشکور ہو گی۔ اس کی کوششیں بلاشبہ بارور ہونگی وہ خوب سمجھتا ہے کہ اس کی جستجو میں کامیابی کیسے کیسے دلفریب مناظر دکھائیگی۔ اور کیا کیا لطیف جذبات پیدا کریگی۔ اب اسے جگنو کی روشنی میں حسن ازل کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ اور دریا کی روانی میں حیات انسانی کے اسرار دکھائی دینے لگے ہیں۔ اور نوا و رسجہ اور شمع بھی زندگانی کی

حقیقت پر روشنی ڈالتے معلوم ہو رہے ہیں۔

اس دور میں خیالات کی پرواز بھی ایسی بلند نہیں۔ اور بیان کی نزاکت بھی ایسی دلربا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہمالہ کی چوٹیاں۔ چاند اور سورج۔ تخیل کی جولانیوں کے میدان نظر آتے ہیں۔ اور ندی کا راگ۔ ابر کہسار کی نغمہ آفرینیاں اور راوی کا زیر و بم۔ کافی دلاویز ہیں۔ مگر اس میں ابھی ہمت کی وہ بلندی اور تخیل کی وہ علو پرواز نہیں جو بعد کی نظموں میں کارفرما ہے۔

تنقید کی نظر ملاحظہ کرے گی۔ کہ بیان میں تا ہنوز وہ لطافت۔ وہ پختگی۔ وہ شوکت نہیں جو ولایت سے واپسی کے بعد اقبال کی شیوا بیانیاں۔ گوناگوں ترکیبوں میں دکھا رہی ہیں۔

ہاں! ایک امر جو اس دور کا مابہ الامتیاز ہے۔ وطن پرستی کے نغمے ہیں۔ وطنیت پر نوا سنجیاں ہیں۔ اور دل سوز اور دل افزا نکتہ آفرینیاں۔ امتیاز ملت و آئین سے بیزاری کا اظہار ہے۔ اور وطن کے بت کی پوجا کا پرچار۔

یہ سچ ہے کہ یہاں بھی اصل اصول یہی ہے۔ کہ

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مگر صاف ظاہر ہے۔ کہ ابھی تک اس پیت کی مے وطنیت کے پیمانہ میں ہی مل رہی تھی۔ اور اس کا نشہ بھی اپنے ملک کی چار دیواری کی فضا تک ہی محدود تھا۔ درست ہے کہ تعلیم بہ لحاظ الفاظ ساری دنیا کو اپنے حلقۂ اثر میں لے رہی ہے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی کتنی پریت میں ہے

لیکن اُس وقت معنوں کے خیال سے دھرتی، آریاورت کے حدود سے پرے تک پھیلی ہوئی وہم و گمان میں بھی ہرگز نہ تھی۔

اس دور میں سب سے اہم بات جو قابل توجہ ہے نظموں میں کسی خاص تعلیم خاص تلقین کی عدم موجودگی ہے۔ آئندہ اوراق میں ہم دیکھیں گے۔ کہ اقبال کی شاعری کا ایک خاص موضوع ہے۔ ایک خاص مقصد ہے۔ اور اس کی نظمیں اسی موضوع۔ اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی۔ اور ترتیب دی گئی ہیں۔ ان میں اس مقصد کے حصول اور اس کی تکمیل کے لئے تعلیم و تلقین ہے۔ اور اقبال کی شاعری کا مرکز وہی تعلیم اور تلقین ہے۔ اور اس کی نظمیں اسی تعلیم و تلقین سے وابستہ اور شگفتہ ہیں۔

اس میں کلام نہیں۔ کہ اس دور میں بھی مسلمانوں کے عادات و اخلاق۔ اہل ہند کے مختلف مذاہب کی باہمی ناروا داری پر مواعظ ہیں۔ جو سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہیں لیکن شاعر کے دل میں ابھی تک وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ جو بعد میں اُسے عجمیت سے متنفر اور حجازیت کا والہ و شیدائی بنائے ہوئے ہے۔ ابھی تک اس کے سامنے کوئی خاص منتہائے مقصد نہیں۔ اسے کسی خاص امر سے شغف نہیں۔ ابھی تک اس کا دل اُن تاثرات سے خالی ہے۔ جو چند سال بعد ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس کے اندر آپ اپنا جہاں پیدا کر لیتے ہیں۔

روانگی یورپ

ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ کو روانہ ہوئے۔ اور حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کی درگاہ میں مزار مبارک کے سرہانے بیٹھ کر التجا کرتے گئے۔

التجا بدرگاہ حضرت محبوب الٰہی

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے

شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہمل زمانے ہیں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان و قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

عجب دعا تھی۔ اور عجب درگاہ۔ اقبال کے حالات مابعد سے ظاہر ہے۔

وطنیت کا خاتمہ اس مرحلہ پر یہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبال کی وطن پرستی کا یہاں ہی خاتمہ ہو گیا۔ اقبال انگلستان گئے۔ فرانس اور جرمنی بھی دیکھ آئے اور ایسے خیالات بدل کر آئے۔ کہ ان کی شاعری مقامی حلقہ بندیوں سے آزاد ہو کر اسلامی عقائد کی وسیع فضا میں سحر آفرینیاں کرنے لگی۔ اور نظمیں ملکی نہیں بلکہ ملی نقطہ نگاہ سے لکھی جانے لگیں۔

یہ تبدیلی کس طرح اور کن حالات میں پیدا ہوئی۔ اوراق آئندہ سے واضح ہو گا۔

دور دوم - ولایت پہنچ کر اقبال نے قانون کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ اور انگلستان اور جرمنی کی مشہور یونیورسٹیوں کے اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے۔

یورپ اور سعی عمل میدان عمل میں فرنگستان کی دوڑ دھوپ۔ اور حالات حاضرہ کی زبردست قوت تاثیر نے اقبال کے دردمند دل میں ہیجان پیدا کیا۔ اور

ان کے حکمت نژوہ دماغ کو ایک نئے سلسلہ جستجو میں سرگرداں کر دیا۔ اقبال نے دیکھا۔ کہ یورپ مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک زندگی کی تگ و دو میں منہمک ہے۔ اور اہل فرنگ۔ امیر سے لیکر غریب تک۔ اور بوڑھے سے لیکر بچے تک۔ زن و مرد۔ دولت۔ ثروت اور حکومت کے نشہ میں سرشار شب و روز محنت و مشقت کی راہوں میں گامزن ہیں۔ اور دنیا کی قیادت کے دعویدار ہو رہے ہیں عمل ان کا وظیفہ ہے۔ کام کرنے میں انہیں مزا حاصل ہوتا ہے۔ جو محض باتوں میں میسّر نہیں۔

ایشیا اور سکون وہ دیکھتا تھا۔ کہ ایشیا والوں کی بزم آرائیاں۔ ان کی تباہی اور خرابی کا باعث ہو رہی ہیں۔ ساقی اور شاعر۔ ایشیا میں عیش و عشرت کے مصاحب ہیں۔ اور سکون و جمود کے ندیم۔

ترک شاعری کا ارادہ یورپ کے مشاہدات نے اقبال پر یہ حقیقت عیاں کر دی۔ کہ سخن گوئی اور سخن سنجی سوائے تضیع اوقات کچھ حاصل نہیں۔ ترک شاعری پر تیار ہو گئے۔ بانگ درا کے دیباچہ میں شیخ عبدالقادر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ کہ قیام ولایت کے ایام میں جب شیخ صاحب موصوف بھی وہاں تھے۔ ایک دن اقبال نے شیخ صاحب سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے۔ کہ وہ شاعری چھوڑ دیں۔ اور جو وقت شعر گوئی میں صرف ہوتا ہے کسی اور مفید کام میں صرف کریں۔

ترک شاعری کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ اور شیخ صاحب کو اس معاملہ میں کہاں تک دخل تھا۔ ذیل کے شعر سے جو اسی زمانہ میں لکھا گیا تھا عیاں ہے۔

مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہدے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

فسخ ارادہ بہرحال شیخ صاحب کے کہنے سننے اور آرنلڈ صاحب کی تائید سے ترک شاعری

کا ارادہ فسخ کر دیا گیا۔ اور عالمی دنیا اقبال کے پاکیزہ خیالات اور حسن بیان کی دولت سے جو بعد میں انہوں نے اپنی نغمہ آفرینیوں کے ذریعے وقف عام کر دی ہے۔ محروم ہونے سے بچ گئی۔

شعر و اشعار پھر ہونے لگے لیکن مغربی روشنی میں ان کا رنگ ضرور بدل گیا۔

شاعری میں تغیرات اب بزم قدرت کا پیامی ظہورات قدرت سے اصول زندگی اخذ کر کے ہمیں اسرار حیات سمجھا رہا ہے۔ چاند اور تارے اس کے حکمت کے کانوں میں راز دنیا کی باتیں کہتے ہیں۔ اور اس کی سحر آفریں زبان آسمانی اسرار کو۔ ہم مٹی کی مورتوں میں جان ڈالنے کی غرض سے۔ سریلی صداؤں میں بیان کرتی ہے۔

زندگی جنبش ہے زندگی جو دور اوّل میں محض ایک تڑپ تھی۔ اب اس تڑپ میں روا روی۔ اور پیش قدمی پر اصرار کرتی ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اور صریح الفاظ میں بتا رہی ہے کہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

شاعر کی نگاہ میں نگاہ صبح و شام۔ قطب اور تاروں۔ ندی اور سجر۔ لالہ و گل میں تاسیہ دوام کا اضطراب دیکھتی ہے۔ اور ہم نادانوں کو جادو اثر الفاظ کے پردوں میں راز حیات کے جلوے دکھاتی ہے۔

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ وگل میں ہے نہاں
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

زندگانی جو پہلے فراموشی تھی۔

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ

اب پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بجائے آگے کی طرف نگراں ہے۔ اور ایک ایسی منزل زیرِ نظر رکھتی ہے جس کی راہ میں تگ و دو لازمی اور دوامی ہے۔

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

ادھر زندگی کے اسرار تو یوں بیان ہو رہے ہیں۔ اور ادھر

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش

نوائے غم اور موت کہ کر "نوائے غم" میں موت کا فلسفہ عجب انداز سے سنایا جا رہا ہے زندگی اور موت۔ خوشی اور غم کے نقشے چاہے کسی رنگ میں دکھائے جائیں۔ اور چاہے ان کی اصلیت کچھ ہی ہو۔ اقبال خوب سمجھتے ہیں۔ اور ہمیں بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ شباب کی نگاہیں۔ اور **شباب** جوانی کے کان۔ رنگ آمیزیوں۔ اور سخن آفرینیوں سے فریفتہ نہیں ہوتے شباب۔ اجل کو پیامِ عیش و سرور ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اور حور و قصور کے وعدوں سے تسلّی نہیں پاتا۔ اس کا تو ایمان ہی اور ہے۔

شباب آہ! کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے

وہ حسن کیا کہ جو محتاج چشم بینا ہو
نمود کے لئے منت پذیر فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ عشرت امروز ہے جوانی کا

آفرینش محبت | قیام انگلستان کے زمانہ کی منظومات میں آفرینش محبت کی وہ دلآویز اور نکتہ آفریں کہانی اور حقیقت حسن کا وہ یاس انگیز منظر ایسے نتیجہ خیز اور ساتھ ہی دلکش ہیں۔ کہ اردو شاعری میں ان کی نظیر نہیں۔

آفرینش محبت میں تخیل کی پرواز ہمیں عرش کے اسرار دکھاتی ہے۔ اور دل لبھانے والے سبق آموز نظاروں سے مسحور کئے دیتی ہے آنکھ دیکھتی ہے۔ دل و دماغ کو سوائے تسلیم چارہ نہیں محبت کے اجزاء۔ ان کی ترکیب ہستی نو خیز پر اس کا عمل۔

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

اقبال کے کمال خیال بندی کے بے بہا گلدستے ہیں۔

حقیقت حسن | اسی طرح حقیقت حسن خدائے لم یزل سے حسن کی شکایت کہ اسے لازوال کیوں نہ بنایا۔ وہاں سے دل شکن جواب۔ اور پھر اس کے چرچے۔ اور اثرات۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی

سحر کے تارے نے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

شاعر کی نازک خیالیوں کی عدیم المثال جلوہ پیرائیاں ہیں۔ خیال کی نزاکت اور بیان کی لطافت اہلِ مذاق اصحاب خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ادا کر سکیں۔

دورِ دوم کی خصوصیات دورِ اوّل سے مقابلہ

اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ اب عالمِ خیال کی فلسفی جستجو میں وہ حیرت آفرینیاں نہیں جو دورِ اوّل میں پریشانیوں کا باعث ہو رہی تھیں۔ اب استفسار اور استفہام کا تجسس ایسا نمایاں نہیں۔ حقیقت آشنائی نے مضطرب طبیعت میں اطمینان پیدا کر دیا ہے۔ اور خیالات میں علو [illegible]

صبح کا ستارہ اور اختر صبح

ہم نے دیکھا ہے کہ دورِ اوّل میں صبح کا ستارہ اپنے ہر روز کے مرنے جینے سے گھبراتا ہے۔ اور گھڑی بھر کے چمکنے پر نالاں ہے۔ اس دور میں اخترِ صبح کی بھی ویسی ہی شکایت ہے لیکن دیکھیے اب نزاکتِ خیال اور حسنِ بیان نے اس شکایت کو کس انداز سے ظاہر کیا ہے۔

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی
ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے
اماں مجھی کو تہِ دامنِ سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا تابندگی شرارے کی

دور اوّل میں بھی تخیل نے صبح کے ستارہ کو آسمان کی بلندی سے زمین پر محبت کے ایک آنسو کی شکل میں ٹپکنے کا متمنی دیکھا ہے۔

خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

اب بھی اختر صبح کو اسی حیات ابدی کی تمنّا ہے۔ صبح کا ستارہ شبنم کی صورت میں پھول پر گرنے کا خیال کرتا تھا۔ اختر صبح کو شاعر کا تخیل اب بھی شبنم کے ہمراہ بلندی سے اترنے کا مشورہ تو دیتا ہے۔ مگر حیات ابدی حاصل کرنے کا طریق۔ پھول پر گرنے یا خاک میں ملنے سے نہیں۔ بلکہ اپنے ریاض سخن کی فضا میں پھیلنے اور پھولنے میں بتاتا ہے۔

ٹپک بلندی گردوں سے ہمرہ شبنم
مرے ریاض سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں محبّت بہار ہے اس کی
بنا مثال ابد پائدار ہے اس کی

گل پژمردہ / گل رنگین پہلے گل پژمردہ اپنی زندگی کے خاتمہ کے مرحلہ پر شاعر کی افسردگی کا باعث تھا۔ اور گل رنگین بھی اپنی سوز بانوں پر خاموشی سے اس کی پریشانیاں

کلی بڑھاتا تھا۔ لیکن اب کلی پھول کی زندگی کے ابتدائی منازل میں ہی شاعر کو طرب اندوز حیات ہونے کا شوق دلا رہی ہے۔ اور اسے آمادہ کرتی ہے کہ

جہان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

حسن و عشق حسن و عشق پر نکتہ سنجیاں ہیں۔ اور انھیں بتایا گیا ہے کہ

حُسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال

کسی کی گود میں بلّی اور کسی کی گود میں بلّی کی حرکات

دیکھتی ہے کبھی ان کو کبھی شرماتی ہے
کبھی اُٹھتی ہے کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے

جو دیکھی ہیں - ان میں تاڑ لیا ہے

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
شیشۂ دہر میں مانندِ مے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

ہر دلِ ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

اور حکمت کی آنکھ پر یہ حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے - کہ

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں

وصال اور شامِ جدائی وصال کی وارفتگی - شامِ جدائی کی ترنم آفرینی پر گل افشانیاں ہیں شام کا خاموش سکون - اور تنہائی کا حزین سکوت - اپنے اپنے انداز میں دلفریب نظارے پیش کرتے ہیں -

عاشق ہرجائی اور سلیمیٰ عاشقِ ہرجائی کی وفا نا آشنائیاں - اور حسن کے عام جلوے

میں حسنِ "سلیمٰی" کی جنون سامانیاں۔ اپنی اپنی محفلوں میں ہنگامے بپا کر رہی ہیں۔ "عاشقِ ہرجائی" صوفیانہ لباس میں قدرت کے کرشموں کا نمائندہ ہے۔ اور حسن و عشق کی تفنن آئینیوں کا پتلا "سلیمٰی" کی مست آنکھ محمل کے پردہ میں بھی صانع کی قدرت کا کمال دکھا رہی ہے۔

تصوف کا رنگ جابجا چمک رہا ہے۔

ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیالہ ہے رنگ و بو کا
کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقین ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

ایک ہندو دوست

اور اسی رنگ نے ایک خدا پرست ہندو دوست کے غرق آب ہونے پر کیسے آب دار اشعار نکلوائے ہیں۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

عشق و محبت کی دلاویز جلوہ آرائیوں سے شاعر کے درد آشنا دل میں جذبات عالیہ کا ایک دریا امنڈ آتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے۔

انسان

لذت گیر وجود ہر شے
سرمست مئے نمود ہر شے
لیکن کوئی نہیں غمگسار انساں
کیا تلخ ہے روزگار انساں

یورپ اور مختلف مراحل حیات

یورپ کی آب و ہوا میں روزگار انسان کی تلخی شدت سے نمودار ہو رہی تھی۔ ذوق آگہی کی دوڑ دھوپ میں زندگی کے عملی پہلو مغربی تہذیب کے نظر فریب مناظر میں نئے نئے جلوے دکھا رہے تھے۔ مختلف مراحل حیات میں حضرت انسان کی دلکش اور شاندار کارپردازیاں بالخصوص میدان سیاسیات میں شوکت وسطوت کے مظاہرے۔ مجالس معاشرت میں طرب وعیش کے سامان۔ سحر طرازیاں کر رہے تھے۔

تہذیب حاضرہ تسخیر عالم میں شب و روز مصروف تھی۔ اور اپنی تمکنت اور تجمل کی حلقہ بندیوں سے سارے جہان کو زیر نگین کرنے میں سرگرم تھی۔ اس کی مجالس میں آزادی۔ مساوات اور اخوت کا غلغلہ تھا۔ اور اس کی محفلوں میں نسل انسان کی ترقی اور بہبودی کے چرچے ہو رہے تھے۔

مگر اقبال کی روشن ضمیری دیکھتی تھی۔ کہ یہ شوکت وسطوت۔ یہ طرب وعیش یہ تمکنت اور یہ تجمل۔ دیرپا نہیں ہو سکتے۔ تہذیب حاضرہ مادیات کی دست پروردہ

تہذیب حاضرہ اور مادیات

ہے۔ اور مادیات محض مادیات ہی کی حامی اور مربی ہے۔ تن پروری اس کا مدعا۔ اور نفس پرستی اس کا مقصد ہے۔ اس کے ایوانوں میں آزادی۔ مساوات۔ اور اخوت کے غلغلے۔ صرف دوسروں کو بے وقوف بنانے۔ اور اس کے شہروں میں ترقی اور بہبودی کے چرچے محض اغیار کو مست تغافل کرنے کے لئے ہو رہے ہیں۔

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر
خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن مدہوش ہے

سیاسیات آزادی مساوات اور اخوت

وہ دیکھتا تھا۔ کہ فرنگستان میں آزادی۔ مساوات اور اخوت انقلاب فرانسیسیہ کے نام لیوا تو ضرور ہیں۔ مگر تہذیب حاضرہ میں

ان کا مفہوم کچھ نرالا ہی ہے۔ یہ اصطلاحات ہیں۔ جو ناداقوں کو پھسلانے کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔ قومیت۔ نسل۔ مذہب۔ اور رنگ۔ ان کے معتول پر متصرف ہیں۔ اور حسب حالات مختلفہ۔ ان کے مختلف معانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں جمہوریت کے پردوں میں قیصریت کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ اور غلامی کی زنجیریں آزادی کی نوبت بجا رہی ہیں۔ ملک گیری کی ہوس نے وطنیت اور قومیت کے ایمان فریب بت تراشے ہوئے ہیں۔ اور ان کے پجاری فدائیت کے نشہ اور ادعا میں غیر اقوام اور غیر ممالک کو یہاں بھینٹ چڑھانے میں دن رات مشغول ہیں۔

صنف نازک وہ دیکھتا تھا۔ کہ صنف نازک جو مغربی تہذیب کے زیر سایہ دنیا کی معاشرت میں اک نمایاں حصہ لے رہی ہے۔ اور انسان کی زندگی میں اس کی دلچسپیاں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یورپ میں باوجود اپنی توبہ شکن نظر فریبیاں کے محاسن نسوانی کے لحاظ سے اپنی غیر مہذب ہندوستانی بہنوں کی ہمسری نہ کر سکتی تھی۔

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

معاشرت معاشرت میں بھی ہوس بازی۔ اور نشاط۔ کارفرما نظر آئے۔ اور حقیقی زندگی کا سوز۔ کیف غم۔ جو اس کی جان ہے۔ مغرب کی سرزمین میں نابود پایا۔

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

اشتیاق خانہ ساز خانہ ساز کا اشتیاق اور بھی بڑھا۔ جب اقبال کی نکتہ رس نگاہ نے دیکھا۔ کہ مغربی تہذیب کے علم بردار۔ اس کے تجمل کی سحر آفرینیوں۔ اور اس کے جبروت کے نشہ کی سرمستیوں میں روحانیات کی اداسیں کشت پشت ڈال کر

خدا اور ہدا کی راہوں سے الگ ہو رہے ہیں۔

یہ اشتیاق اور بھی زیادہ ہوا جب اقبال کا دل محسوس کرتا تھا۔ کہ ایشیا کے لاڈلے بچے۔ اور بالخصوص مسلمان۔ چاروں طرف سے ظلمات کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ مغربی شائستگی کے شیدائی ہو رہے ہیں۔ اور اسی فریفتگی میں سلف کی روایات سے بیزار۔ مستقبل سے مستغنی۔ حال مست۔ بے فکر۔ اور بیکار۔ اور اس حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ کہ نئی روشنی محض ایک شعبدہ ہے چھلاوا ہے مشرقی پاکیزگی اور حقیقی نور اس میں نایاب ہیں۔ نادان کھوٹا اور کھرا نہیں پہچان رہے۔ اور سونا چھوڑ کر پیتل کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

اقبال نے اپنے ہم وطنوں۔ اپنے ہم مشربوں کی اس ابلہی۔ اس عواقب ناشناسی سے متاثر ہو کر ان کے انتباہ کے لئے راز کی بات۔ ایک دلکش انداز میں کہہ دی۔

پیر مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

اور۔

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

فرنگستان کی بود و باش اور اس کا اثر۔

"مئے مجاز" سے نفرت۔ اور "خانہ ساز" کی رغبت ظاہر کر رہی ہے کہ فرنگستان کی بود و باش۔ وہاں کے مشاغل۔ مشرقی اور مغربی فلسفہ کے ملاپ۔ اسلامی اور غیر اسلامی خیالات اور واقعات کے اجتماع نے اقبال کے دل و دماغ پر حیرت انگیز اثر کیا۔ مغرب کی آب و ہوا میں اس کی سابقہ تعلیم و تربیت نے ایک زبردست قوت نمو محسوس کی۔ اور نئی روشنی کی برقی طاقت نے دل کے سوز۔ اور دماغ کی بصیرت میں حدت پیدا کر دی۔

اور پرانے اسلامی خیالات۔ پرانے مشرقی مذاق اور جذبات کو نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اس کا زاویۂ نظر کشادہ ہو رہا تھا اس نے یورپ کی مادہ پرستی کا نشۂ مشرقی دردِ دل کے کیف سے محروم پایا۔ اور مغرب کی آزادی کے قفس میں غلامی کی زنجیروں کا شور و شیون سُنا۔

انی جاعل فی الارض خلیفہ

اقبال کے خیالات و جذبات جو اسلامی تعلیم کے ناز پروردہ تھے۔ اولادِ آدم کے عالم وجود میں آنے کے راز سے ناآشنا نہ تھے۔ اس کے عقیدہ میں انسان اس جہان میں خدا کے نائب کی حیثیت میں موجود ہے۔ اور نصِ قرآنی کے رو سے خلافتِ الٰہیہ اس کی ہستی کی تعبیر ہے۔

احساس واقعات اور وسعتِ نظر نے ان خیالات اور جذبات کو حکمت کی کٹھالی میں حل کیا۔ اور دکھا دیا کہ نسلِ انسان کی حقیقی ترقی کا راز روحانیات سے وابستہ ہے۔ مادیات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ انجن کی سیٹی کل کے پُرزے۔ طیاروں کی جھنکار۔ انسان کو معراجِ ترقی پر۔ جو اسے خلافتِ الٰہیہ کی شان و عظمت قائم کرنے اور رکھنے میں مدد دے۔ نہیں پہنچا سکتیں۔ اور یہ ترقی صرف پاکیزگیٔ نفس اور روحانی زندگی کے تزکیہ اور اس کی تکمیل سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ پاکیزگیٔ نفس اور روحانی زندگی کی تکمیل کے لئے کیسے کلام ہو سکتا ہے۔ اللہ سے عشق اور خلق اللہ سے۔ عام اس سے کہ کوئی کالا ہو یا گورا۔ سرخ ہو یا پیلا چین کا باشندہ ہو یا عرب کا روس کا رہنے والا ہو یا فرانس کا۔ جاپان میں سکونت رکھتا ہو یا امریکہ میں۔ ہندی ہو یا افریقی۔ محبت اور ہمدردی درکار ہے! اور اس میں بنی آدم کی سچی خوشی اور مرفہ الحالی مرکوز ہے۔

کیفیتوں کی رستخیز اور ذلولوں کے ہنگامے۔ شاعر کے دل میں ایک طوفان بپا کر رہے تھے۔ حالات موجودہ کی ویرانی کا ہیولیٰ جس اس کے آئینۂ صفت

تخیل نے آئندہ واقعات کی صاف و شفاف تصویریں ایک لطیف پیرایہ میں کھینچیں۔ اور اس کی جادو بیان زبان نے حالات حاضرہ کی حقیقت من وعن ظاہر کر دی۔ جو کچھ ہو رہا ہے۔ بے نقاب اس کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے۔ وہ بھی شاعر کی چشم بینا سے پوشیدہ نہیں۔

شاعر کی چشم بصیرت نے مادی تہذیب کی عالیشان عمارات کی بنا ریت پر دیکھی۔ اور اس کے ظاہری سامان سطوت و شوکت۔ شان و تجمل میں خرابی اور بربادی کے آثار پائے خاموشی گناہ سمجھی۔ بول اٹھے۔

مادی تہذیب کا حشر

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

الہامی الفاظ جو جنگ عالمگیر سے کئی سال پہلے حقیقت ترجمان زبان سے نکلے تھے۔

اب کون نہیں جانتا کس طرح جنگ چھڑی۔ دنیا کی مہذب قومیں کیا مدعا پیش نظر رکھ کر شریک جنگ ہوئیں۔ اور تہذیب کے دلدادوں نے شائستگی کن نئے نئے اصولوں اور نئے نئے سامانوں سے۔ خدا کی بہترین مخلوق۔ اور انسان کی اعلیٰ ترین مصنوعات کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں گوئے سبقت لے جانے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ سلطنتیں برباد ہو گئیں۔ قومیں تباہ ہو گئیں۔ اور ایک عالم تا حال جنگ کی ویرانی۔ اور رنج و آلام سے نالاں و پریشاں ہے۔

عالمگیر آزادی کی لہر

صرف یہی نہیں بلکہ عام آزادی کی لہر جو اس جنگ عظیم کے بعد دنیا میں ہلچل مچا رہی ہے۔ جمہوریت اور حریت کا تقاضا جو اقوام کر رہی ہیں۔ شاعر کی نکتہ رس طبیعت نے حالات حاضرہ کے آئینہ میں برسوں پہلے ہی مشاہدہ کئے

اور اپنے سحر طراز قلم سے ان کے دلآویز مرقعے دیکھنے والوں کے لئے صفحۂ قرطاس پر دلآویز لباس میں نقش کر دیئے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا وہ اب دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

عرب کی بیداری اور عربوں کی حکومت آرائی کا خصوصیت سے ذکر ہے۔

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

آزادی کے خیالات میں حالات حاضرہ نے جو تبدیلیاں کی ہیں اقبال کی سرگوشیاں چمنستان عالم میں کئی سال پہلے ہی ان کا چرچا کر چکی ہیں۔

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

شور و اور اقبال

شور و اور شورش اقبال کا شیوہ نہیں ہے اور وہ طبعاً ان باتوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہیں کہ دنیا شور و اور شورش چاہنے والوں سے خالی نہیں اور کبھی خالی نہ ہوگی۔

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
وہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

اغیار کچھ کہیں - اور کچھ کریں - اقبال کا اپنا عقیدہ تو یہ ہے -

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

اقبال اور زندگی کا مدعا

ان کے نزدیک زندگی کا مدعا اور ہے - وہ تو خدا کے عشق میں بھی کسی اور ہی تڑپ کے دلدادہ ہیں -

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

زندگی اور محبت

اس نے دیکھا ہے - اور عالم بالا کے کیمیا گر نے اسے مشاہدہ کرا دیا ہے - کہ دنیا اور ما فیہا میں زندگی کا جوہر محبت کی تڑپ ہے -

ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطف خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

اور یہ محبت کا پجاری - تہذیب حاضرہ کی دستبرد کے ہنگاموں سے بیتاب اور پریشان ہوا جاتا ہے -

بھول تو اے بزم جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

اور اس افسردگی سے محبت کے آغوش ناز کے سوا کہیں امان اور اطمینان نہیں پاتا یہاں حکمت اور فلسفہ نے کبھی کچھ امداد نہ کی - اور

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

حکمت کی الجھنوں کو چھوڑ۔ اور تہذیب حاضرہ کی شوکت وسطوت۔ اور اس کے تجمل وشان سے منہ موڑ کر۔ اقبال جس کی گھٹی میں۔ صوفیانہ مذاق اور طبیعت میں اسلامی تعلیم وتربیت نے محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اور جسے فلسفی جستجو نے محبت کی سحرکاریوں کا رازدار بنا دیا تھا۔

اقبال اور اس کا اصول زندگی

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اپنا اصول زندگی بنا لیتا ہے۔ اور اسی محبت کی راہوں میں اپنا نصب العین یوں بیان کرتا ہے۔

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش
آہ! وہ کامل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں

اقبال کی شاعری اور محبت نوع انسان

اس کامل تجلی کے ذوق طلب نے اقبال کی شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے بنی آدم کو نئی تہذیب کی غلامی کی زنجیروں سے نجات دلوانے۔ اور حقیقی آزادی۔ اور سچی خوشحالی کے حصول کی راہ محبت نوع انسان میں دیکھی فلسفی دماغ نے محبت بھرے دل سے شرکت کار۔ اور جادو اثر زبان سے معجز بیانیوں کی استمداد چاہی۔

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

رستہ کی مشکلات

رستہ کی مشکلات ظاہر تھیں لیکن شاعر مقصود نے ہمت کے قدم مضبوط کر دیئے تھے۔

سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

ہمراہیوں کی تنگ نظری کہیں کہیں ہمراہیوں کی تنگ نظری کا بھی ٹوڑ رہا لیکن یہ خدا کا بندہ اور خلق خدا کا عاشق اس سے کب گھبرانے والا تھا۔ ایسے ایسے ہمراہیوں کی پرواہ بھی نہ تھی۔ وہ شروع سے ہی انہیں جواب دے رہا ہے۔

بھلا نبھے گی تیری ہم سے کیوں کر اے واعظ

کہ ہم تو رسم محبّت کو عام کرتے ہیں

وطنیت کی تنگ دامانی اس نے وطنیت کی تنگ دامانی اور تنگ حوصلگی کو رسم محبّت کو عام کرنے کی ذمہ داری اٹھانے سے گریزاں پایا لیکن مذہب نے توحید الٰہی کی روشنی کی چمک میں حصول مراد کی شاہراہ دکھائی۔ اور اقبال کے لئے یہ شاہراہ نئی نہ تھی۔

شریعت اسلامی تیراں سو سال سے زیادہ ہوئے جب سے اس شاہراہ کے نشانات قائم کر دیئے گئے تھے۔ اور دُور دُور تک اس کی تکمیل بھی ہو چکی تھی۔ اس شاہراہ سے ہماری مراد شریعت اسلام ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور اسلامیوں نے اعلائے کلمتہ اللہ۔ اور اخوّت کے زرّین اصول کی اشاعت اور تلقین کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور دنیا کے ایک گوشے سے لیکر دوسرے گوشے تک توحید اور مساوات کا بول بالا کر دیا تھا۔

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے

مئے توحید کو لیکر صفت جام پھرے

اور اللہ سے عشق اور باہمی اخوّت و مساوات کی یہ کیفیت تھی۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز

قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اقبال دیکھتا تھا کہ تاحال مسلمان۔ اپنی اس گئی گذری حالت میں بھی توحید اور اخوت کے قائل نظر آتے ہیں۔ رسم محبت کو عام کرنے میں شرکت کار کے لئے اس نے بھی مسلمانوں کو ہی مخاطب کیا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمع بزم حاصل سوز و ساز دے

شاعر کی طبیعت کا میلان۔ اور اس کی آئندہ سخنوری کا انداز بتا رہا ہے۔

اقبال کا جادۂ عمل

جادۂ عمل اور مقصد زندگی جواب اقبال صراحتاً اور بداہتاً بیان کر رہے ہیں۔ دور اوّل میں آفتاب صبح کو مخاطب کرتے ہوئے ظاہر کر چکے ہیں۔ اگرچہ وہاں امتیاز ملت و آئین سے آزادی کے اشارات ہیں۔ لیکن جادۂ عمل اور مقصد زندگی کے اصول وہی ہیں۔ جواب بھی ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے
زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لئے
آرزو کچھ ہے اسی چشم تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیازِ ملت و آئین سے دل آزاد ہو

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں
ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر
نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر
شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو
سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو

یہ تھا دورِ اوّل میں شاعر کی طبیعت کا انداز۔ لیکن بعد میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اس میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ اب ملت و آئین کی حلقہ بندی ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اب اسلام اور اسلامیوں پر اقبال کی نوا پیرائیاں وقف ہو گئی ہیں۔ اور اس واسطے کہ شاعر خوب جانتا ہے۔ کہ رسمِ محبت کو عام کرنے کی غرض سے۔ نوعِ انسان کو ایک قوم بنانے کے لئے۔ سارا جہان اپنا وطن سمجھنے کے لئے۔ اسلام اور اسلامیوں کی شرکت کار ہی مؤثر ہو سکتی ہے۔ یہی مذہب۔ یہی قوم ان اصولوں کی قائل۔ اور علمبردار ہے۔ اور اسی مذہب اور اسی قوم کی پائمردی سے۔ دنیا میں اخوت۔ مساوات۔ اور آزادی کے شاندار ایوان قائم ہو سکتے ہیں۔

اخوت اور اسلام

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

۱۹۰۸ء میں اقبال نے طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام چند اشعار لکھ کر بھیجے تھے۔ ہندوستان میں ۱۹۰۸ء سیاسی ہلچل کا سال تھا اور اقبال نے انگلستان سے ہی اپنا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا تھا۔ اشعار میں لطف خرام۔ اتحاد ملی۔ ذوق طلب۔ اور سوز دل کی طرف نوجوانان اسلام کی توجہ دلائی ہے۔ اور ایک لطیف پیرایہ میں ان اصولوں کو جزو زندگی بنا لینے کا انہیں سبق دیا ہے۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

اس نظم کا آخری شعر

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

مسلمانوں کو سبکسری اور بے ہنگام شورشوں سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور اتنے سالوں کے بعد بھی یہ مشورہ مسلمانان ہند کیلئے قابل غور ہے۔

اقبال کی شاعری کا نیا ورق

اقبال کی شاعری کا نیا ورق جو مغرب کی ہوا سے الٹ گیا۔ ان اشعار سے جو آپ نے فرنگستان سے واپس ہوتے ہوئے

اپنے قدیم رفیق خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب کو مخاطب کر کے لکھتے ہوئے نمایاں ہے۔

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے۔ کہ دیار مغرب نے اقبال کی طبیعت پر کچھ ایسے اثرات ڈالے۔ اور وہ اثرات اُن کے دل میں کچھ ایسے جا گزین ہوئے۔ کہ اسلامیوں کی غفلت جمود۔ اور پستی۔ کی سرزمین میں تحریک اور ارتقا کا بیج بونے اور اس بیج سے ثمر پیدا کرنے پر اقبال نے اپنی سخن آفرینیوں کی آبیاری کا سلسلہ وقف کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

غیر اسلامی تعلقات سے بیزاری۔ اور اسلامی روایات سے دل بستگی۔ اور ان پر جان نثاری۔ کی تیاریوں کے پتے دے رہا ہے۔

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

اہل عرب اور اسلامیوں کی جو کسی زمانہ میں دنیا کو سیاست کا سبق دیتے تھے موجودہ سیاسیات عالم سے بیخبر آگہی۔ اور حکمرانی کی سعی میں ان کے خفتہ پا سکون کے پتے دے رہا ہے۔ اور اسلامیوں کو زمانہ حاضرہ کے احساس واقعات۔ اور پھر سیاسی دنیا کی چالبازیوں سے انہیں شناسائی کرا دینے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

صرف اسی قدر نہیں بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں خود افزائی کا مذاق پیدا کر کے انہیں خیال بے مقدوری کے قعر ذلت سے اٹھانے اور نکالنے کا تہیہ کرتا ہے

باده دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

اور تمنی ہے۔ کہ وہی پرانی مے توحید ہو۔ وہی پرانا اسلامی نشہ ہو۔ اس میں حدت پیدا کی جائے۔ اور حدت بھی وہ کہ جس کسی کے منہ لگے تن بدن گداز کر دے اور حالت جمود و سکون سے نکال کر حرکت اور عمل کے میدان میں لے آئے۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

شاندار اور پاکیزہ زندگی جس کی تمنا بھی فضائے عالم میں نور برسا رہی ہے۔

دوسرے دور پر اجمالی نظر

دوسرے دور کی نظمیں فرنگستان کی آب و ہوا کی زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ ان میں لطافت اور نزاکت دلفریبی کے انداز میں جلوہ گر ہے۔ خیالات کی پرواز عرش تک کی خبریں لا رہی ہے۔ اور تخیل کی سبک سیری ابتدائے آفرینش کی باتیں بتا رہی ہے۔ شاعر اب بزم قدرت کا راز دار ہو چلا ہے۔ اب اسے عالم بالا کے کیمیاگر کی حرکات و سکنات سے واقفیت حاصل کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ اور محبت کا نغمہ۔ اور اس کی تاثیر اس سے مخفی نہیں رہی۔ اب اسے حسن اور خدائے لم یزل کی گفتگو سننے کا فخر حاصل ہے۔ صرف یہی نہیں اس گفتگو کے چرچے بھی محفل قدرت میں اس نے دیکھے اور سنے ہیں۔ مظاہرات قدرت جو پہلے ہمارے فلسفی شاعر کے استفسارات پر کم توجہ کرتے تھے۔ اب خود اسے حال دل سناتے ہیں۔ اور اس کی ہمدردی کے متمنی نظر آتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصت نظر نہ ملی

ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شے
اماں مجھی کو نہ دامنِ سحر نے ملی
بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا تابندگی شرارے کی

پھول کی کلی جو نشۂ ہستی میں موجِ نسیم کا گہوارہ بناتے جھول رہی تھی اور دستِ گلچیں کی چھٹک سے گریزاں تھی۔ اب سامنے مہر کے دل چیرے رکھ دیتی ہے اور شاعر کو حسنِ ازل کی تجلیات کے جھولے میں طرب اندوزِ حیات ہونے کا سبق دیتی ہے۔ اب تو خود فرما رہے ہیں۔

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں

غزلیات میں حسن و عشق کے وہ راز و نیاز اب کہاں۔ تصوف، حکمت۔ اور فدائیتِ ملت۔ نغمہ سرا ہیں کہیں تصوف پکار کر کہہ رہا ہے۔

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

کہیں حکمت چاند اور تاروں کی گفتگو میں سمجھا رہی ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اور کہیں ملی آشفتگی اپنی جنون سامانیوں سے شعلہ فشاں ہے۔

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

فرنگستان کی معاشرت۔ فرنگستان کی سیاست نے اقبال کی شاعری پر اثرات ڈالے جن سے اس کا انداز بدل گیا۔

وہاں بزم جہاں کے ہنگامے اگرچہ دلکش تھے۔ مگر اس کے تماشاؤں میں ہمارے شاعر نے قدرے افسردگی پائی۔ اور اس کی حکمت کی آوارگی نے مدت کے بعد کوئے محبت میں آسودگی کی صورت دیکھی۔ ادھر تہذیب نو کی صولت اور آسائش کی بنا دامنے ناپائدار نظر آئی۔ اور ادھر تہذیب حجازی کے مزار پر اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے۔ اسی اضطراب کی حالت میں قدسیوں نے اسے خاموشی حجاز کی زبان سے خوش خبری سنائی۔

جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا پھر استوار ہوگا

اس دل افزا نوید کے بھروسہ پر اس نے تہیہ کر لیا۔ کہ میدان یثرب کے شیدائیوں کو آرزوے نو سے شناسا کر دیں۔ پرانی شراب ہو۔ اس میں نئی تب و تاب ہو۔ میکش پھر سے از سر نو مست ہو جائیں۔ محفل اغیار کی دُردکشی سے نفور ہوں۔ اور اپنی مجلسیں گرما دیں۔

رخت جاں بتکدہ چیں سے اٹھالیں اپنا
سب کو محو رخ سعدیٰ و سلیمیٰ کردیں

نئی تہذیب کے اثراتِ بد سے مسلمانوں کو بچایا جائے۔ اسلامی شعار کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے۔ اور اسلامی روایات کی توقیر اور ان کے تحفظ پر زور دیا جائے۔

قومیت کے خیال نے موافق آب و ہوا پاکر دل شاعر میں خوب نشو ونما پائی۔ وجود افراد کو اس نے مجازی قرار دیا۔ اور ہستی قوم کو حقیقی سمجھا۔ اور ملت پر فدا ہونا اپنا فرض۔ اس نے پیکار زندگی میں ترقی کے درجات دیکھے اور خودی اور خود افزائی میں انسان کی شان کا کمال۔

وطنیت کے بُت سے بیزاری ظاہر ہونے لگی۔ اور اسلامی حصار ملت کی بنا اتحاد وطن کی اینٹ اور پتھر کی عمارت سے کہیں بالاتر نظر آئی۔

سیاسیات میں اگرچہ مغربی تدبیر پر نکتہ چینیاں ہیں۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنیگا ناپائدار ہوگا

مگر ہندوستانیوں کو مشورہ ہے کہ۔

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

ایک بات جو اس دور میں رونما ہوئی۔ وہ اقبال کے خیالات میں یوروپ کے تاثرات سے۔ اہم تبدیلیاں تھیں۔ جو ولایت سے واپسی کے بعد اس کے اشعار میں نمایاں ہیں۔ یہ تبدیلیاں کس طرح اور کن اسباب سے واقع ہوئیں۔ ہم بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ البتہ ناظرین کے لئے یاد دہانی کے طور پر سفر انگلستان کے اثرات کا خلاصہ جو اقبال نے عبدالقادر کے نام نظم لکھ کر دیا ہے۔ یہاں دوبارہ لکھ دیا جاتا ہے۔

نظم کا ایک ایک شعر پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔ تہذیب یوروپ

نے اقبال کے دل میں جو جذبات پیدا کئے تھے۔ اس نظم میں جلوہ آرا ہیں۔ اور اس کے لیے کسی لفظوں کا فضا کا یہاں موٹے خطوں میں عیاں ہے۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ یثرب میں ہُوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں

خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں
ہر چہ در دل گذرد وقف زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

دور سوم ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اقبال انگلستان میں شاعری سے بیزار ہو گئے تھے۔ اور اپنی اس بیزاری کا سبب انہوں نے خود ہی بیان کر دیا ہوا ہے۔

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

شاعری ہجوم جذبات۔ اور وسعت خیالات نے سخن گوئی اور سخن سنجی سے نکتہ نگاہ میں تبدیلیاں پیدا کیں اور شاعری جو پہلے اہل مجلس کے لیے محض سامان طرب سمجھا گیا تھا۔ قومی زندگی کی روح رواں نظر آنے لگا۔

شاعروں کو اگر کہے بات کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری
اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

یہاں تک کہ

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو کلی نہ ہو سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

اب جو شعر نکلتے تھے آبدار ہوتے تھے اور قوم کے سامنے بیش بہا موتیوں کے خزانے لنڈھا دیتے تھے۔ جو بات کہی جاتی تھی۔ کھری کھری ہوتی تھی۔۔ اور مسلمانوں کو در کامل عیار کی دولت سے مالا مال کر دینے پر تلی ہوتی تھی۔

ایک دعا اس نئے دور میں اقبال نے رب العالمین کی درگاہ میں دعا کے ہاتھ اٹھائے ہیں۔ اور مسلم کی سعی عمل میں تائید ایزدی کی یامردی مانگی ہے مناجات اقبال کے جذبات اور ولولے جوان کی جادو بیانی وقتاً فوقتاً دلفریب لفظی لباس میں جلوہ آرا کرتی رہی ہے۔ بارگاہ ربانی میں پیش کر کے برکت الٰہی کی خواستگار ہے۔ غور سے دیکھا جائے۔ تو اقبال کی شاعری انہی جذبات اور ولولوں کی تشریح یافتہ ہے۔ اور ان کی سخن آفرینی دنیائے اسلام میں بھی جذبات اور ولولے پیدا کرنے کی کفیل ہو رہی ہے۔ خداوند عالمیان سے شاعر کی التجا ہے۔ کہ مسلمانوں کے دل ذوق عمل سے گرما دے۔ ان کے دلوں میں تمنا پیدا ہو۔ اور تمنا صرف نی اور اتشرفی کی گود میں سونے والی نہیں۔ بالیدگی کی تمنا۔ تمنا جس میں زندگی کی حرارت اور تڑپ موجود ہو۔ وادی فاران کے فیض عام کا ہر ایک گوشہ پہنچے سے لیکر بوڑھے تک ذوق تقاضا میں ساعی ہو۔ اور شوق تماشا میں ہمہ تن چشم دنیا اور مافیہا کو آنکھیں کھول کر دیکھے۔ اور دیکھے کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور کیا کچھ ہونے والا ہے۔ اسلام کے نام لیوا۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سب کے سب وہ بھی۔ جو اس وقت صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے قسم قسم کے معابد کے پجاری بن رہے ہیں۔ اپنے اس پرانے کعبہ کی طرف رخ پھیر لیں۔ اور مقامی پابندیوں سے آزاد ہو کر عام اخوت اسلامی کی پرفضا وسعت میں گرم سیر ہو جائیں۔ شک نہیں کہ اسی تک وہ دو میں خاردار جھاڑیاں طے کرنی ہونگی۔ جو رنج و تکلیف ہی دینگی۔ پیروں میں چھالے بھی پڑ جائیں گے۔ .. ..

لیکن اس سعی میں وہ حدت درکار ہے۔ اور اس دوڑ دھوپ میں وہ

تیزی مقصود ہے جو کانٹوں کے منہ پھیر دے۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ انہیں جلا کر راکھ کر ڈالے۔ دل و دماغ میں محبت نبوی کا نور جلوہ گر ہو۔ رفعت مقاصد زیر نظر ہو۔ محبّت بے لوث ہو۔ صداقت بے باک ہو۔ خودداری اور آزادی حاصل ہو۔ مصائب کا احساس پیدا ہو جائے۔ اور یہ احساس دلوں میں مستقبل کی فکر۔ اور مستقبل کو بنانے کی لگن پیدا کر دے۔

دعا بتا رہی ہے کہ شاعر کا نصب العین کیا ہے۔ اس نصب العین کو مدنظر رکھ کر اقبال نے اپنی ابتدائی نکتہ آفرینیوں کو اب عملی صورت دی ہے۔ اور قوموں کی حقیقی زندگی۔ اور حقیقی ترقی کے اصولوں کی تعلیم۔ اور بالخصوص مسلمانوں کی روایات سلف کی تلقین کی ہے۔ اب شعر کا مقصد محض نزاکت خیال یا لطافت بیان تک محدود نہیں رہا۔ اور تصوّف یا حکمت کی نکتہ سنجیوں پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اخوّت عام۔ خودی اور خودداری۔ اور سب سے بڑھ کر عمل کی تعلیم اس کا موضوع ہیں۔ اور اسلامیوں کو ان کے اسلاف کے حالات سنا کر۔ ان کے اپنے موجودہ حالات سے شرم دلا کر۔ ایک شاندار مستقبل کے لیے انہیں آمادہ کرنا ہے۔ اعلائے کلمۃ اللہ۔ اور محبّت اور اخوّت کی صدائے عام پر جا بجا زور دیا گیا ہے۔ مذہب کی اہمیّت اور جمعیّت ملّی کی ضرورت مختلف پیرایوں میں ظاہر کی گئی ہے۔ اور نیند کے متوالے سست مسلم کو احساس بے مقدوری کی زنجیروں سے آزاد ہو کر میدان عمل میں تگ و دو کرنے کے لئے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ستارہ

دور اوّل میں "ستارہ" تقاضائے اجل سے نالاں ہے اور اس زندگی کا خواہاں ہے۔

جو ہو نہ شناسائے اجل

دوسرے دور میں بھی اسے یہی شکایت ہے۔ اور یہی تمنا۔ اور ہمارا فلسفی شاعر ثبات ابدی کی دلفریب تصویروں سے۔ اپنے ریاض سخن میں۔ اس کا دل لبھاتا ہے۔ مگر اب جو ستارہ کی وہی موت سے گھبراہٹ دیکھی حقیقت ترجمان زبان نے محض خیالی اور دل خوش کرنے والی باتیں چھوڑ کر سمجھنے والوں کے لئے زندگی کی حقیقت اور موت کی اصلیت صاف صاف بیان کر دی۔

جھلکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے
وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

قانون فطرت کے اصول بصنعت اشارہ کے رموز کس لطافت سے ادا ہوئے ہیں۔ اور زندگی کے اصول۔ انفرادی اور قومی زندگی کے اصول کس نزاکت سے سمجھا دئے گئے ہیں۔

دو ستارے | وہ ستارے جو وصل دائم کے خواہش مند نظر آئے۔ انہیں، اور ان کے ذریعے ہمیں، آئین جہاں سے مطلع کر دیا ہے۔

ہے خواب ثبات آشنائی
آئین جہاں کا ہے جدائی

بزم انجم | اسی طرح بزم انجم نے بھی۔ ہمارے اس تیرہ خاکدان ہستی کو منور کرتے

کی غرض سے۔ راز زندگی پر ضیا پاشیاں کی ہیں۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہمارے غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

فارسی اشعار پر تضمین

اس دور میں فارسی اشعار پر تضمین جابجا نظر آتی ہے۔ اور فارسی اشعار کی رغبت اس دور کی خصوصیت ہے۔ تضمین کیا ہے۔ سوز دل سے اس پرآشوب زمانہ میں گوہر آفرین تخیل سے موتیوں کی لڑیاں پروئی ہیں۔ اور تہذیب حاضرہ پر مسلمانوں کی شیدائیت کے قلندرانہ انداز سے دکھا کر انتباہ کی برجیاں قائم کر دی ہیں۔ اسلامیوں کی آئین آبائی سے بیزاری، اور غیر اسلامی شعائر پہ فدائیت اور جاں نثاری کس انداز سے بیان کی ہے۔

کنشتی ساز اور کلیسائی

تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے
کنشتی ساز معمور نواہائے کلیسائی
ہوئی ہے تربیت آغوش بیت اللہ میں تیری
دل شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

شکایت کس قدر دردناک ہے۔ مسلمان ہیں۔ کہ کس کے جنے کس کے پالے۔ اور اب کہاں کے شیدائی۔ اور کس کے مفتون ہو رہے ہیں۔ مسلمان ہیں۔ کہ محبت اللہ کی تربیت۔ اور صنم خانہ کا سودا۔ وفا کا سبق یہاں سے لیا۔ اور اغیار کے ہاں جا کی۔ جواہرات ادھر سے پائے۔ اور ادھر جا کر لٹا دئے۔ اور اس پرتے پر اترا رہے ہیں۔ اور نہیں جانتے۔ کہ کدھر جا رہے۔ کیا کر رہے۔ اور کیا کرا رہے ہیں۔

تعلیم اور الحاد اس فرائیت اور جاں نثاری کے فتنہ پرور مظاہرے دل گداز پیرائے میں دکھائے ہیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی۔ کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ

اور اس کے اثرات دلخراش انداز میں بیان ہوتے ہیں۔

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے۔ مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

ان حالات میں بتایا گیا ہے۔ کہ سوائے اس کے چارہ نہیں کہ۔

تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم ز خجالت نتواں کرد درو

اور اسی سلسلے میں ان گم کردہ راہوں۔ نئی تہذیب کے شیدائیوں کو سمجھایا گیا ہے

ارشاد کلیم

غافل اپنے آشیاں کو آکے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طور معنی پہ کلیم نکتہ ہیں

سرکشی با ہر کہ کردی رام او باید شدن
شعلہ ساں از ہر کجا برخاستی آنجا نشیں

وضعداری اور وفاکیشی کی کیا ہی اعلیٰ تعلیم ہے۔

تہذیب حاضرہ اور اس کی حرارت

تہذیب حاضرہ کی ویراں کاریوں کا نظر فریب نقشہ قابل دید ہے۔

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
کیا ذرہ کو جگنو دیکے تاب مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی۔ یہ بیداری۔ یہ آزادی۔ یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں۔ تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگرچاکی
کیا گم تازہ پروازوں نے اپنے آشیاں لیکن
مناظر دلکشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت۔ خودفروشی۔ ناشکیبائی۔ ہوسناکی
فروغ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی
تو اے پروانہ ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری

اس تصویر سے جو شاعر کے جادو رقم قلم نے عبرت کی آنکھوں کے لئے کھینچی ہے۔

اسلامیوں کے اخلاقی تنزل کی گہرائیاں ہولناک اور دل ہلا دینے والی نظر آ رہی ہیں۔ مگر نادان مسلمان نئی روشنی کی جگمگاہٹ پر فریفتہ ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ وہ راہِ راست سے کتنی دور جا پڑا ہے۔ کہنہ اور اک شاعر اسے سمجھاتا ہے اور اس کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے۔ کہ مانگی ہوئی ضوء میں حقیقی نور کی کیفیت نہیں۔ وہ کیفیت۔ اپنے دل کی روشنی میں ہی مل سکتی ہے۔ روشنی جو سوزِ دل سے نکلے۔ اور اپنی ضیا پاشیوں سے ایک عالم کو منور کر دے۔ اور انسان کو خود فروشی کی ذلت کے گڑھوں سے نکال کر منازل علوی کی راہ پر لے چلے۔

تو ای پروانہ ایں گرمی ز شمع محفلے داری
چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری

اس ضمن میں "خطاب بہ جوانانِ اسلام" بھی ہے۔ یہ ایک دردمند دل کی دردناک آواز ہے۔ اس کے سننے میں ایک مزا ہے۔ جو درد والوں کا ہی حصہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ آپ سارا خطاب پڑھیں سنیں۔ اور مزا لیں۔

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں خلاق آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارہ
سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے

کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاندار و جہانبان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظّارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار۔ تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا۔ کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی۔ کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

نوجوان مسلم کو پُر درد الفاظ - پُر درد لہجہ میں - اس کے مذہب - اس کی ملّت کی روایات کی طرف توجہ دلائی ہے - اسے یاد کرایا ہے - کہ اس کی قوم - قوم جس کا وہ لاڈلا بچّہ ہے - کس قدر جاہ و جلال حشمت و سطوت - تمدّن اور امارت میں شہرہ آفاق - اور یکتائے روزگار رہی ہے - اس کی روایات کیسی شاندار رہی ہیں - اور اب وہی قوم - اسی قوم کی اولاد - سلف کی میراث گنوا کر قعرِ ذلت میں پڑی سسک رہی ہے - حکومت کا مسلمانوں

کے ہاتھوں سے نکل جانا تو خیر۔ دنیا کا دستور یہی ہے۔ اور اس پر افسوس لاحاصل۔ لیکن علم کے خزانے جو ان کے آباء نے دلسوزی اور جان کاہی سے اکٹھے کئے تھے۔ مسلمان وہ بھی دوسروں کے حوالے کر بیٹھے ہیں۔ اور ان کے دل پر ملال تک نہیں آیا۔ ان کی آنکھوں کا نور۔ اغیار کے دل و دماغ روشن کر رہا ہے۔ اور انہیں اپنی بے بصری کا احساس تک بھی نہیں۔

"خوابگاہ نبی" پر نئی روشنی کے خلاف شکایت بھی سننے کے قابل ہے۔ رہنمایان قوم کے طریق کار۔ نبی کریم۔ اور سنت نبوی سے ان کی ناآشنائی۔ رسول عربی۔ اور ان کے اسوۂ حسنہ سے ان کی اجنبیت۔ پر پھبتیاں ہیں۔ جو شاعر کا درد دل ظاہر کر رہی ہیں۔

خوابگاہ نبیؐ اور ایک شوریدہ

کل ایک شوریدہ خوابگاہ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تیری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

قوم رسول ہاشمیؐ اقبال کی تعلیم میں خدائی رسی کو مضبوط پکڑنے پہ جا بجا اصرار ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں۔ کہ جمعیت اسلامی کا اصول۔ قومیت مغربی کے نظریہ سے بالکل الگ ہے۔ اور قومیت اقوام مغربی کے معیار سے ملت رسول ہاشمی کا اندازہ کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

وہ جمعیت ملی کا قائل اور شیدائی ہے۔ وطنیت کو اس کے منافی سمجھتا ہے۔

وطنیت اور صریح الفاظ میں وطنیت کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

صدیق اکبرؓ اس دور میں اسلامی اخلاق۔ اور اسلامی اوصاف پر چھوٹی چھوٹی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا عشق رسولؐ میں انہماک۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

بلالؓ حضرت بلالؓ کی محبت نبوی میں محویت۔

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر

شہادت کی آرزو ان بزرگوں کا تو کیا ذکر ہے ایک عامی مسلم کی فراقِ رسولؐ میں بے تابیاں۔ اور میدانِ جنگ میں شہادت کی آرزو۔

اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

محاصرۂ ادرنہ اور محاصرۂ ادرنہ میں۔

چھوٹی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

روایاتِ اسلامی کی شاندار مثالیں ہیں۔ جو دلکش اور موثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔ شفاخانۂ حجاز اور دریوزۂ خلافت اسی قبیل سے ہیں اور اسلامی کیرکٹر کی روح پرور تصویریں جن پر تہذیبِ حاضرہ بھی خراجِ تحسین ادا کرنے سے نہیں رک سکتی۔

شفاخانۂ حجاز

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضر نے مےِ عمرِ دراز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں
آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

دریوزۂ خلافت ہمت غیرت اور حمیت کے رنگ ملاحظہ ہوں۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

ولایت سے واپسی اگست ۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے واپس آگئے۔ اور یہاں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اپنی آئندہ شاعری کے جادۂ عمل کا خاکا عبدالقادر کے نام، ایک نظم لکھ کر شائع کیا۔ یہ خاکا۔ غور سے دیکھا جائے۔ تو آنے والی نظموں کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ اشارات و کنایات میں جو بعد میں شکوہ جواب شکوہ۔ شمع و شاعر۔ خضر راہ۔ اور طلوع اسلام میں تخیل کی صورت گری سے حسن ادا اور خوبی بیان کا جامہ پہن کر جلوہ آرا ہوئے۔

منظومات دور سوم ان نظموں میں بتایا گیا ہے۔ کہ مادہ پرستی سے سچی خوشی اور نسل انسان کی حقیقی ترقی ممکن نہیں۔ اور تجربے سے یہ امر پایۂ ثبوت کو بھی پہنچ چکا ہے۔ کہ بنی آدم کی مسرت اور اس کے ارتقا کا راز روحانی زندگی ہی میں مضمر ہے۔ دنیا کو ظلمت اور تباہی سے بچانے کے لئے نور توحید سے اقصائے عالم کو منور کرنا ضروری ہے۔ اور اس لئے اسلامیوں کو۔ جو امانت توحید کے حامل ہیں۔ لازم ہے۔ کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں۔ نور توحید پھیلانے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اور مساوات و اخوت کا سبق جو ان کے پیارے نبیؐ نے انہیں دیا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہوں۔ اور قول سے فعل سے۔ اس سبق کی تعلیم عام کر دیں۔

نور توحید اسلامیوں کو جتا دیا گیا ہے - کہ خلافت الٰہیہ کا قیام و استحکام فضائے عالم میں نور توحید کے اتمام سے - اور مسلم کی زندگی کا مقصد - دنیا میں اس کے رہنے کا مدعا - سوائے اس صداقت کی اشاعت - اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اور کچھ نہیں - اور اس خلافت کی بنا دنیا میں استوار کرنے کے لئے - اور اس صداقت توحید کی امانت کا بوجھ اُٹھانے کے لئے مسلم کو - اسلاف کا قلب و جگر - جو آج کل نایاب ہو رہے ہیں - کہیں سے ڈھونڈ کر لانے کی ضرورت ہے - اسلاف کی صفات اور اسلاف کی عادات درکار ہیں -

صفات مسلم قلب سلیم ہو حمیت ہو - بے باک صداقت ہو - اور فوق الادراک شجاعت ہو - آنکھوں میں حیا اور دل میں خوف خدا ہو - باطل کے مٹانے والے بے لاگ اور بے رعایت عدل کرنے والے - اپنی قوت بازو پر نازاں - میدان عمل کے شہسوار - محض گفتار نہیں بلکہ سراپا کردار - آپس میں رحیم - ایک دوسرے کے خطا پوش اور باہم کریم - غیور و خود دار - اور اخوت پر نثار ہوں -

اخوت ان کا وظیفہ ہو - اور مساوات اُن کا شیوہ -

اب مسلم نے اگر اس دنیا میں زندہ رہنا ہے - تو اُس کے لئے لازمی ہو گیا ہے کہ سکون و جمود سے جو آج کل اس کی زندگی کا شعار ہو رہا ہے - بیزاری دکھائے - زندگی کی حقیقت سے آشنا ہو - تگا پوئے دمادم میں سر حیات دیکھے - اور سمجھے اور دل نشین کر لے - کہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اور اپنی زندگی کے مدعا - نور توحید کے اتمام میں گرم سیر ہو جائے - اور بےمقصدی کا خیال جو اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہو رہا ہے - اور محض اس کی تن آسانی

اور غلبہ مادہ پرستی نے پیدا کر دیا ہے۔ اقبال اسے اس خیال کی حیثیت۔ اس کی اپنی اصلیت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی اصلیت

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچہ چاک گریباں میں کبھی،
قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اور پھر

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

حقیقت تو یہ ہے۔

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

خودی

اور اس خودی کے احساس کو مسلم کے دل میں پیدا کرکے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ وہ علو ہمت سے کام لے۔ خود اپنے دل کے اندر ایک نئی دنیا بنالے۔ نئے نئے جذبات ہوں۔ نئے نئے ولولے ہوں۔ نئی کشمکش ہو۔ نئے ہنگامے ہوں۔

اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو۔ اور اغیار کی محتاجی سے قطعاً آزاد کسی کے پاس حاجت لے جانے سے۔ چاہے جان بچانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ مرنا بہتر سمجھے۔ اگر خودداری اس کا شعار ہوگا۔ اگر خودی کا احساس اسے میسر ہوگا۔ تو مصیبت میں درجات برکت۔ اور افتادگی میں سامان سرفرازی ملینگے۔ مرنا کیا۔ اور خاک میں دب جانا کیا۔

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثال دانہ کر

آپ دیکھینگے کہ خودی ممکنات زندگی کی دولت سے مالا مال خاک میں ملتے ملتے بھی اپنی قوت بالیدگی سے دیکھنے والوں کو حیران کردیگی۔ اور دنیا میں ایک غلغلہ مچادیگی۔

مذہب اور سلطنت جب اس کا مقصد اتنا ارفع و اعلیٰ ہوگا۔ اس کی زندگی کا مدعا ایسا پاکیزہ ہوگا۔ اسے اپنی حقیقت کا احساس ہوگا۔ اور خودی اور خودداری اس کے دل کو گرمائیگی۔ تو اسلامی حکومت اور سلطنت کا زوال اسے کسی طرح ملول و پریشان نہ کرسکیگا۔ اقبالؒ کا یہ مذہب ہے۔ اور ان کے نزدیک ہر ایک مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے کہ مسلم کی ہستی کا راز حکومت نہیں بلکہ مذہب ہے۔ اور صداقت توحید کی تبلیغ و اشاعت اس کی زندگی کا مقصد ہے۔

قوت مٹ جائیگی ایمان کے مٹ جانے سے
نشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے
کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے

عصر نو رات ہے دُھندلا سا ستارا تو ہے

اقبال مسلم کے دل میں مذہب کی بنا مستحکم دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اور اسی پر اس کی ہستی۔ انفرادی۔ اور مجموعی کا انحصار سمجھتے ہیں۔ وہ مختلف پیرایوں میں۔ نئے نئے طریقوں سے یہاں تک کہ ہمیں یقین دلانے کے لئے۔ خود اللہ جل جلالہ کی زبان سے بھی ہمیں بتلاتے ہیں۔

تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری

وہ جانتے ہیں۔ کہ حکومت سلطنت۔ دولت اور سیاست۔ ایسی چیزیں نہیں جن کے لئے انسان بے قرار ہو۔ افسردہ خاطر ہو۔ اور پریشان دل رہے۔ ذوقِ یقین پیدا ہو۔ تو یہ خود بخود آجاتی ہیں۔

یہ سب کیا ہیں۔ فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں اسی لئے ان کا تو مشورہ ہے۔ کہ

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو

ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

وہ خوب سمجھتے ہیں۔ کہ حرم حصار دین کا مرکز ہے۔ اور اس کی پاسبانی کے لئے اقبال عالم اسلام کی قوتوں کے اجتماع کے خواہاں ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

وہ یہ بھی سمجھتے ہیں۔ کہ عاملان قضا و قدر حرم کی پاسبانی کے لئے عالم اسلام تو کیا دشمنان اسلام کو بھی مقرر کر دیا کرتے ہیں۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ربطِ ملت ربط و ضبطِ ملتِ اسلامی میں ہی اقبال مشرق کی نجات دیکھتے ہیں اور ایشیا والوں کو بالخصوص اس نکتہ سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقین ہے۔ کہ مسلمان سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائیگا۔ اور اس واسطے ان کی ہدایت ہے۔

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

وطنیت ظاہر ہے۔ کہ اسلامیوں کی اس عالمگیر جمعیت کا قیام مقامی پابندیوں کا منافی ہوگا۔ اور اخوتِ اسلامی کی تعلیم بھی امتیازِ رنگ و خون سے بیزاری دکھلاتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو ربط و ضبطِ ملت ناممکن جمعیت محض ایک خواب ہوگا۔ اور پھر اسلام اور اسلامیوں کا صفحۂ ہستی پر رہنا موہوم۔ اقبال جو کبھی امتیازِ ملت و آئین سے گھبراتے تھے۔ اور وطنیت کے شائق تھے۔ اب اسلامی جمعیت کے استقلال و استحکام کی تمنا میں ان کی وسعت نظر وطن کی چاردیواری کی پابندیوں سے آزاد ہو گئی ہے۔

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

ان کی تلقین ہے۔ اور اخوت کی وسیع حلقہ بندی کے لئے وہی خدائی رسی درکار ہے۔ اور بس۔ اور اس حلقہ بندی میں۔

جو کریگا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائیگا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر

جمعیت | اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ کہ جمعیت ہی میں برکت ہے۔ اور اس سے الگ ہونے میں ذلت اور رسوائی ہے۔ اقبال ہمیں جمعیت کی اہمیت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس غرض سے گوناگوں تشبیہوں سے انسانی زندگی میں اس کی قدر و منزلت کے مراتب ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تلقین میں جمعیت اسلامی کا مسئلہ مہات امور میں سے ہے۔ وہ مسلم کی انفرادی۔ اور مجموعی زندگی کے لئے ربط و ضبط ملت نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو یہ حقیقت۔ ربط و ضبط قائم رکھنے کی ضرورت۔ ہر وقت مدنظر رکھنے کے لئے ہدایت کرتے ہیں۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا۔ تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی۔ دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں۔ اور بیرون دریا کچھ نہیں

ترانۂ ملی | اس دور کا ترانہ۔ ترانۂ ملی کے نام سے مشہور ہے۔ اور اقبال کے خیالات

کا جو ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ آئینہ ہے۔

چین و عرب ہمارا۔ ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے۔ سارا جہاں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے۔ قومی نشاں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے۔ تو امتحاں ہمارا
سالار کارواں ہے۔ میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

شکوہ اس دور کی پہلی نظم جو ولایت سے واپسی کے بعد اوّل ہی اوّل اقبال نے لکھی اور اسی انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی شکوہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسلام اور اسلامیوں کی محبت نے اقبال کے دل میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ چین نہیں پڑتا تھا۔ وقتاً فوقتاً مختلف رنگوں میں اس کی جھلکیاں اپنے جلوے دکھا دیتی تھیں

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیا

انہیں یاد تھا۔ اور یہی تپش آمادگی پیدا کرنے کے خیال سے شاعر نے شکوہ کی ترکیب میں ملت اسلامیہ کے گذشتہ کارنامے۔ موجودہ بے بسی خستہ حالی ناداری۔ اور بے کسی کا پہلو دکھانے کے لئے ایک عجیب انداز اختیار کیا ہے مسلم خستہ حال کی زبان سے اپنی ایشیائی مجبوری کے جمود میں پناہ لینے کی

عادت سے خدائے عزّوجل کی بے التفاتی کو ملّی بے بسی کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے اور اس رنگ میں قوم وملّت کی پستی کا ایک درد انگیز نقشہ کھینچا ہے۔

تاب سخن کی جرأت آموزی۔ اور فکر رسا کی شوخ طبعی نے شکوہ ترتیب دیا ہے۔ شکوہ مسلم کو خدائے عزّوجل سے ہے۔ شوخی انداز نمایاں ہے۔ اپنی وفاشعاریوں۔ خدمت گذاریوں کے تذکرے ہیں۔ اور درگاہ کبریائی کی بے نیازیوں کی شکایتیں۔ اسلوب بیان قابل داد ہے۔ ایک وہ دن تھا کہ

کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر

ذات باری کی شان وحدانیت سے لوگ بے خبر تھے۔ دنیا ناآشنا تھی۔ جدھر جاؤ۔ کفر والحاد کے چرچے تھے جس طرف دیکھو۔ انسان کی نظر "پیکر محسوس" کی اس قدر خوگر ہورہی تھی۔ کہ اس کا ان دیکھے خدا کو ماننا امر محال تھا۔

اسلامیوں سے پہلے دنیا میں سلجوقی بھی آباد تھے۔ تورانی بھی تھے چینی بھی تھے۔ ساسانی بھی تھے۔ یونانی بھی تھے۔ یہودی بھی تھے۔ نصرانی بھی تھے۔ سب ہی تھے لیکن کسی نے بھی توحید کی شہادت میں انگلی تک نہ اٹھائی۔

ایسے آڑے وقت میں جبکہ بات ساری بگڑی ہوئی تھی۔ اسلامیوں اور تنہا اسلامیوں نے ہی۔ توحید کی اشاعت۔ اور تبلیغ وتائید میں قوت بازو سے کام لیا۔ اور بگڑی بات پھر بنادی۔

بروبحر میں سر بکف پھرے۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کی دھن میں لڑتے مرتے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد۔ اپنی حیات کا مدعا اعلائے کلمۃ اللہ ٹھیرا لیا تھا۔ دن رات اسی نشہ میں سرمست۔ دوسروں کو سرشار کرتے۔ پہاڑوں اور جنگلوں۔ دریاؤں۔ اور سمندروں میں۔ دوڑتے پھرے۔ اور عشق الٰہی کی دشوار گذار راہوں میں ان کی اس سعی کے نتائج کون نہیں جانتا۔ جہاں گئے کامیاب

ہوئے۔ جدھر رُخ کیا۔ فتح و نصرت نے قدم لیے۔ باطل صفحۂ دہر سے مٹ گیا۔ قرآن پر لوگ ایمان لے آئے۔ اور نوع انسان مسلم کی پاکیزہ گیوں سے غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو گئی۔ دنیا بھر میں خدا کے گھر کے سوا۔ اور کوئی قبلہ نہ رہا اور وہاں اسلام کی صف آرائیوں میں آقا اور نوکر مساوات کے جھنڈے تلے دوش بدوش کھڑے ہونے لگے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اسلامیوں کی جاں نثاری۔ اور جان کاوی نے اپنائے عالم میں اللہ کے نام کا بول بالا کر دیا۔ اور ان کی دل باختگی اور شیفتگی نے اللہ اکبر کے نعرے آسمانوں تک پہنچا دئے۔

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وقت آیا۔ تو مسلم کی زبان زیر خنجر بھی پیغام حق سنانے سے نہیں رکی۔

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

در خیبر کا اکھاڑنا۔ شہر قیصر کا مفتوح کرنا۔ مخلوق خداوندوں اور معبودوں کے پیکر توڑنا۔ اور کفار کے لشکروں کے لشکر کاٹ کر رکھ دینا۔ بازوئے مسلم کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔ اور کس نے کیا۔ ایران کے آتش کدے کس نے ٹھنڈے کئے۔ اور یزدان کے تذکرے کس کی ہمت سے پھر زندہ ہوئے۔ کیا مسلم کے سوا کوئی اور بھی تھا۔

ادھر تو یہ نیاز کے انداز - اور ادھر بے نیازی کی یہ شان -

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

کافر ہے کہ حور و قصور سے بہرہ ور ہے - دولت و ثروت - اس کی خانہ زاد لونڈیاں اور عیش و عشرت اس کی ہمراز سہیلیاں ہیں - اور مسلمان ہے کہ حور و قصور تو درکنار - غریب فقط وعدہ حور پر ہی جی رہا ہے - اس کی ناداری کی کوئی انتہا نہیں اور اس کی ذلت و خواری کی کوئی حد نہیں -

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

اس ناداری و خواری پر طعن اغیار نے شوخی کی زبان کھول دی - اور کفر کی خندہ زنی نے خوئے تسلیم میں بے باکی پیدا کر دی - عشق الٰہی کا دلدادہ تسلیم و رضا کا شیدا - خدا کی یاد میں بے قرار - آئین وفا کا پیرو کار - آداب کے لحاظات - حفظ مراتب کی رسوم - فراموش کر دیتا ہے - اور شوخی اور بے باکی کی باتیں کر رہا ہے -

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے

بات کہنے کی نہیں۔ تو بھی تو ہرجائی ہے

زبان کی شوخی تو ظاہر ہے لیکن اسلامی دل کی عقیدت مندی اس شوخی میں بھی تڑپ رہی ہے۔ اللہ جل شانہ کو ہرجائی کہہ تو دیا لیکن حاضر ناظر خدا کی صفات کے پردہ میں پناہ گزیں ہو کر التجا کے ہاتھ اٹھائے ہیں۔ اور نیاز کے انداز میں اس ہرجائی کو فاران کی چوٹیوں کی ضیا پاشیاں۔ اور سرزمین ہند پر مسلم کی سوختہ سامانیاں یاد دلا کر مخاطب کیا ہے۔

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی

بے حجابانہ سوئے محفل ما باز آئی

حسن و عشق کے مذہب میں شکوہ کا مقصد۔ شکایتوں کا مدعا محبوب سے راہ و رسم کا بڑھانا ہوتا ہے۔ ایک جانباز عاشق۔ آئین وفا کا شیدائی کبھی ارادت کا جادہ پیما جب دلربا کی بے اعتنائی سے۔ رقیبوں کی کامرانیوں سے تنگ آجاتا ہے۔ اپنی نامرادیوں سے بیزار۔ اپنی ناکامیوں پر آزردہ خاطر ہو رہا ہوتا ہے۔ اور محبوب تک رسائی حاصل کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں دیکھتا۔ تو موقعہ پا کر شکووں اور شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے۔ شاعر نے بھی یہاں اسی انداز۔ اسی مدعا۔ اور اسی مقصد کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہی حسن و عشق کی زبان ہے۔ وہی عاشق معشوقی کا طرز بیان۔ ویسے ہی شکوے۔ ویسی ہی شکایتیں وہی منشا۔ اور وہی مطلب کلام میں تلخی بھی ہے۔ جوش بھی ہے۔ انکساری بھی ہے۔ ناراضگی کے آثار بھی ہیں۔ لیکن آخر میں عجز و نیاز ہے۔ منت ہے۔ رضا جوئی کی تمنا۔ اور التفات کی آرزو ہے۔ اور ہمدردی اور توجہ کی امید میں اغیار کی اقبال مندی اور مسلم کی خستہ حالی کی ایک ہوش ربا تصویر کھینچ کر سرفراز اور اسے ناز کا طلبگار ہے۔

بادۂ کہنہ غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کو کو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوق دل افروزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

اور اس لئے کہ زمانہ کے نشیب و فراز کی ٹھوکریں کھا کر مصیبتیں جھیل کر۔ اب آہستہ کچھ ہوش آنے لگا ہے۔ احساس واقعات نے اپنا اثر دکھایا ہے۔ اور قوت عمل نے اس کے منجمد حسیات کے اندر گدگدی سی پیدا کرنی شروع کی ہے۔ اس کا دل جو گرویدہ عجم ہو رہا تھا۔ اس کا دماغ جو خریدۂ ادا ہائے نامسلمانی ہو چکا تھا۔ اب پھر حجاز کی طرف رجوع کرنے لگا ہے۔

مقوم آوارہ عناں تاب ہے۔ پھر سوئے حجاز عجمیت کے دلربایانہ فتنہ پرداز انداز اپنا جوہر دکھا چکے ہیں۔ اور غیر اسلامی شعائر اپنے نظر فریب مناظر میں ہولناک آثار ویراں کاری ظاہر کر چکے ہیں۔ اب پھر حجاز کے جنون پرور صحرا اور نجد کے دشت و جبل میں لیلا کے دیوانے محمل لیلا کے مشتاق نظر آتے ہیں۔ اک نگاہ کرم کی ضرورت ہے۔

مشکلیں امت مرحوم کی آساں کر دے
مور بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے
جنس نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں مے چکد از حسرت دیرینۂ ما

مے تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

شکوہ تو حقیقت میں یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ اور باقی تین بند قوم کی بجائے شاعر کی اپنی طبیعت کا الجھاؤ۔ جذبات۔ قوم کی ناہنجاری۔ غفلت اور بے اعتنائی کا آئینہ ہیں۔ شاعر مایوس ہے۔ پریشان خاطر ہے۔ اور مضطرب ہے۔

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خون جگر پینے میں

لیکن وہ ان مایوسیوں میں بھی اپنی زبان کی قوت تسخیر پر بھروسا رکھتا ہے۔ اسے اپنی سحر بیانی پر اعتماد ہے۔

کتنے بیتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اور اگرچہ اسے افسوس ہے۔ کہ کوئی سننے والا ہی نہیں۔

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

باوجود ان مشکلات کے جو اس کے سامنے ہیں۔ وہ اپنی نوا ریزیوں سے امید رکھتا ہے کہ۔

چاک اس بلبل تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہد وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

اور اس بنا پر کہ۔

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے میری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے میری

شمع وشاعر
اقبال کی بہترین نظم شمع وشاعر کے لئے بھی قوم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ہی کی مرہون ہے۔ اس میں اقبال کے قومی جذبات نے ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ شاعری حقیقی شاعری۔ قوم اور زمانہ کے حالات کا آئینہ۔ اور شاعر ہمیشہ اپنی قوم اور اپنے زمانہ کے مذاق۔ اس کی خصوصیات۔ اور حسیات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اور اقبال نے اسی نظریہ کو سامنے رکھ کر اپنے جادو رقم قلم سے۔ شاعر۔ شاعری۔ اور مسلمانوں کے موجودہ انحطاط کا ایک نہایت ہی دردانگیز معنی خیز خاکا عبرت کی آنکھوں کو دکھایا ہے۔ نظم شمع اور شاعر کے مابین مکالمہ کی صورت میں ہے۔ زمانہ حال کا شاعر باوجود اپنے مدت العمر کے سوز وگداز۔ اور صدہا جلوہ سامانیوں کے پریشان ہے۔ کہ اس کی دلسوزی۔ اس کی جانکاوی کا کوئی اثر نہیں۔ کوئی نتیجہ نہیں۔ وہ جانتا ہے۔ کہ وہ سوز ہی کیا۔ جو دوسروں کو نہ جلائے۔ وہ جلوہ ہی کیا جو دیکھنے والوں کو دیوانہ نہ کردے۔ اور بے تڑپائے شمع سے اپنا مقابلہ کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے۔ کہ گھر کی روشنی محفل کی رونق۔ اس سے ہے۔ اس کا شعلہ جاں نثار پروانوں کی مشتاقی سے فروزاں ہے۔ اور ادھر یہ بیچارہ شاعر۔ چراغ صحرا کی طرح ناکارہ۔ اس پر مرنے والوں کا تو کیا ذکر۔ کسی دیکھنے والے نے بھی تو اس کی طرف رخ تک نہیں کیا۔ یہ ہے شاعر کا سوز۔ اور جلوہ آرائیاں۔ اور وہ ہے شمع کا جلنا۔ اور اس کی گرمیاں۔ آخر اس کا راز کیا ہے۔ اسی راز کے انکشاف کی جستجو میں شاعر نے شمع کو مخاطب کیا ہے۔ اور اقبال کی جدت طبع نے زبان شمع سے وہ گل افشانیاں کی ہیں۔ کہ سخن شناسی کی آنکھیں حیران ہیں۔ اور قدردانی کی نگاہیں قربان۔

شمع کا جلنا۔ خود شمع بیان کرتی ہے۔ اس کے فطرتی سوز کا ظہور ہے۔ اور اس کا رات بھر پگھلنا اس کے طبعی گداز کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ پروانہ

اس پر سو جان سے قربان ہیں۔ اور چاہنے والے آگے پیچھے۔ دائیں بائیں نثار ہو رہے ہیں۔

شاعر بھی ایسے ہی جان نثاروں کا طلبگار تو ہے۔ مگر کوئی چاہنے والا نہیں کوئی مرنے والا نہیں۔ اور مرے بھی کوئی کیسے۔ کیوں۔ اس کے کلام میں شمع کی زبان سے یہ بات ٹپکتی ہے۔ کہ سوز کے آثار تو ہیں۔ مگر نمائشی نالے بھی ہیں۔ مگر کا پیدا گر نمائشی۔ واہ واہ کی ہوس نے یہ نمائشی آثار ظاہر کئے ہیں۔ اور تالیوں کی دلفریب آوازنے یہ نمائشی نالے نکلوائے ہیں۔ یہ سوز دل کی آگ سے پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ نالے درد جگر سے نہیں اٹھے۔ آئین بات اور۔ اس کا شعار اور رکھے اس کے پہلو میں اور یہ خود بینہ فاشہ کا سودائی۔ خود فروشی اس کا چلن۔ جمعیت سے بیزاری اس کا شیوہ۔ اس کی شاعری نام ونمود چاہ ذقن میں غرق اور کمند زلف کی اسیر ہے۔ اور خود شاعر نے خال ہندو کی خاطر سمرقند و بخارا تک بخش کر قوم کی ویرانی پر مہر لگا دی ہے۔ اور یہ خدا کا بندہ قمار خانے میں بیٹھے دل لگا کر کعبتین کی دھن میں ہے اور اس کے ساتھ ہی دین و ایمان کو بھی ہرا بیٹھا ہے۔ شمع کی زبان علی رؤس الاشہاد اسے بتا رہی ہے۔ کہ ان حالات میں

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

اور اگر چشم بینا ہو۔ تو دیکھے۔ کہ اس زمانے میں سخن آفرینی اور نغمہ سنجی بے سود ہے مسلمانوں کی بے حالی سے ان میں وہ اللہ کے پیارے۔ رسولؐ کے عاشق۔ اسلام کے والا و شیدا ہی نہیں رہے۔ مسلمانان درگور مسلمانی درکتاب۔ اب انہیں کوئی سنائے تو کیا سمجھائے تو کس طرح۔ سمجھنے والے تو درکنار کوئی سننے والا ہی نہیں۔

تھا جنہیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا

اور سب سے مایوس کن امر یہ ہے کہ مسلمان بے حس ہو گیا ہے۔ اسے احساس ہی نہیں رہا۔ یہ اسلاف کے کارناموں سے بے خبر ہے۔ اور اپنے تنزل سے بے پرواہ۔ اور اس سارے جمود کا گناہ۔ اس سارے عدم احساس کی ذمہ واری کا بوجھ شمع کی نظروں میں شاعر کے سر پہ ہے۔ اور اس لئے کہ وہ صاف کہہ رہی ہے۔

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

اور کون نہیں جانتا۔ اس کا نتیجہ لابدی تھا۔

شوق بے پروا گیا فکر فلک پیما گیا۔
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

ان مایوسیوں کے ہجوم میں۔ اس جانگداز ہوا کی فضا میں۔ اب شاعر ہزار باتیں بنائے۔ کون کان دھرتا ہے۔ لاکھ راگ الاپے۔ کون سنتا ہے۔ اور جیسا کہ ادھر بیان ہو چکا ہے۔ اب مشکل تو یہ آپڑی ہے۔ اور مصیبت تو یہ ہے۔ کہ اب سننے والے ہی نہیں رہے۔ ذوق والے ہی اٹھ گئے ہیں۔

آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلا رہی۔ لیلا کے دیوانے رہے

رونا تو اس بات کا ہے کہ مسلمان جو کبھی شہسوار میدان عمل تھا۔ غفلت کی نیند سو گیا ہے۔ اور اب تو اس پر مردنی چھا رہی ہے۔ ان ساری تباہیوں سے جو حالت تھی۔ وہ ناگفتنی تو تھی ہی۔ مگر اس پر طرہ یہ۔ جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے۔

کیونکہ مسلم کو ہوش میں لانے کے لئے یہی ایک بات بار بار کہنے والی ہے۔ "کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا"۔ اگر آج ہی اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو جائے۔ آج ہی یہ سمجھنے لگے۔ کہ یہ کدھر سے کدھر جا رہا ہے۔ تو یہ ساری ناداری ساری ذلت۔ ساری رسوائی دور ہو جاتی ہے۔ اور پھر قوم کا بیڑا پار ہے۔ افسوس کہ یہ بندہ خدا مذہب کی شیرازہ بندی۔ اور آئین ملت کی پابندیوں کو جو حیات ملی اور عیش دوام کی کفیل ہیں۔ توڑ بیٹھا ہے۔ اس کی قوت عمل سلب۔ اور سکون و جمود اس کا خاصہ ہو گیا ہے۔ کنج تنہائی میں خاموش بیٹھا ہے اور اگر کبھی مجبور ہو کر باہر بھی نکلتا ہے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ شور و شیون کے سوا اور کسی بات کے قابل نہیں رہا۔

ایک دن وہ تھا۔ کہ اس کی ہنگامہ آرائیوں سے ویرانے آباد ہو رہے تھے اور آج ہم ان آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ اس کے مسکن تباہ۔ شہر برباد۔ اور اس کی آبادیاں ویران ہو رہی ہیں۔ مسلمان جو مذہب کا دلدادہ تھا۔ اور جس کی نمازوں نے اقصائے عالم میں سطوت توحید قائم کی تھی۔ ہندمیں بتوں کا شیدائی ہو گیا ہے۔ اور یہاں اس کی نمازیں اصنام کی خدمت گذاریوں میں ادا ہوتی نظر آتی ہیں۔ پابندی آئین ترک۔ رحمت الٰہی سے ناامیدی۔ خانہ سوزی کا سامان کر کے۔ بے کسی اور بے بسی کے گوشے میں۔ اشک پیہم کے طوفان سے آنکھیں بند۔ چپ چاپ پڑا ہے۔

قوم کے ادبار کی ان گھنگور گھٹاؤں میں بھی اقبال مایوس نہیں۔ اس نے شمع کی زبان سے شاعر کی کمزوریاں گنتی ہیں۔ اور شمع و شاعر کے مکالمہ کے سلسلہ میں ہمارے لئے فصاحت سے بیان بھی کر دی ہیں۔ اس نے یہ بھی بتا دیا ہے۔ کہ شاعر کی یہ کمزوریاں۔ کہاں تک قومی ادبار کی ذمہ دار ہیں۔

قومی تنزّل۔ اور قومی تنزّل کے عدم احساس کا رونا بھی رو رہا ہے۔ اور ان حالات میں شاعر کی بزم آرائیاں بے سود بھی بتائی ہیں۔ مگر اقبال مایوس نہیں۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

اس کی جوہر بیں طبیعت۔ اور اس کی پس پردہ دیکھنے والی نگاہ دیکھتی ہے۔ کہ اسلام کے شیدائی اب کچھ ہوش میں آ رہے ہیں۔ اور مغرب کی خواب آور مئے پندار سے بیزار ہو کر بادۂ عرفان الٰہی۔ اور رسولؐ کی محبّت کے نشہ کی جستجو میں تڑپنے لگے ہیں۔ اسلام کی خودداری جو ایک مدّت سے اغیار کے ہاتھوں مدہوشی کی نذر ہو چکی تھی۔ اب اسلام کی خدمت میں مخصوص ہو چلی ہے۔ اور غیر اسلامی شعار پر محویت کی زنجیریں توڑ کر خالص اسلامی روایات کی شیفتگی میں سرگرم ہو گئی ہے۔ اب شاعر۔ اگر چاہے اور خدا اُسے توفیق دے۔ تو قوم کی خدمت کر سکتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ سوز دل سے بات کہے۔ اور مردہ دل قوم کو اس سوز کی گرمی سے زندہ کر دے۔

امید کی اس روح افزا جھلک میں اقبال نے اپنے سحر آفریں الفاظ میں صورت حالات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور مسلمانوں کو بتایا ہے۔ کہ اُن کے ذوق تن آسانی نے اُنہیں کہاں تک پست ہمت بنا دیا ہے۔ ذرا غور کرنے پر وہ دیکھیں گے۔ کہ ان کی صحرا نورد جفاکش آزاد زندگی گل و گلزار کی دربند آسائش میں کس مزے کی میٹھی نیند سو رہی ہے۔ انہوں نے کس قدر تغافل اور بے پرواہی سے اپنی اصلیّت فراموش کر دی ہے۔ اور اخوّت اسلامی کے مرکز سے الگ ہو کر اپنی پریشانی اور بربادی کے کیا کچھ سامان مہیّا کر دئے ہیں۔ اگر ان کی آنکھیں کھلی ہوں۔ تو قطرہ کی زندگی میں اسرار حیات

دیکھ لیتے۔ اور پھر کبھی ان کے دل میں جمعیت سے الگ ہونے کا خیال تک پیدا نہ ہوتا انہیں معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ کہ ملت کی آبرو جمعیت سے تھی۔ اور جمعیت کا نابود ہونا ہی افراد کی رسوائی کا باعث ہو رہا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال فراموش کار مسلم کو یہ ساری باتیں۔ ایک ایک کر کے یاد کراتے ہیں۔ اس کے انحطاطِ قومی اور انفرادی۔ کی گہرائیوں کے ڈراؤنے نظارے دکھانا چاہتے ہیں لیکن کنایات و اشارات سے ہی مسلم کو جمعیت کی رسی مضبوط پکڑنے پر آمادہ کرنے میں کوشاں ہیں۔ وہ اسے ربطِ ملت کی قدر و منزلت سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور ہدایت کرتے ہیں۔

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

ربطِ ملت کے لیئے محبت کی ضرورت۔ دکھاوے کی محبت نہیں۔ شور و غوغا کرنے والی محبت نہیں۔ رسوا کرنے اور تڑپانے والی محبت نہیں۔ بلکہ وہ محبت جو سچی ہے۔ محبت جو ہمیشہ کے لیئے دل میں گھر بنا لے۔ اور تن من پھونک کر اپنی تجلی زار میں آباد ہو۔ اور دیکھنے والوں کو حیران و خیرہ کر دے۔

مسلم کو چاہیئے۔ اقبال کی تلقین ہے۔ کہ ذوقِ طلب میں ساعی ہو۔ خودداری اور علو ہمت کو ساتھ لے۔ نئے نئے میدانِ عمل پیدا کرے۔ پرانی بنیادوں پر نئی شاندار عمارات بنائے۔ اسلام کے مستحکم اصول نہ چھوڑے۔ روایاتِ اسلامی کے حلقے میں رہے۔ اس کی خودی اور خودداری کی جنون سامانیاں پہنائے عالم میں غلغلہ مچادیں۔ اس کی خود افزائی کی جھنکار آرائیوں

کے دنیا میں طنطنے ہوں۔ آگے اور پیچھے "ہاں بڑھے چلو" کے آوازے ہوں۔
کیونکہ یہاں خاموشی گناہ ہے۔ اور پست ہمتی بدترازگناہ۔
اقبال ہمیں بتاتے ہیں۔ کہ مسلم کی یہ پست ہمتی محض اس کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کاش مسلمان اپنی حقیقت سے آشنا ہوتا۔ اور خودداری اور خودافزائی کے ذوق سے آگاہ۔ نادان جانتا نہیں۔

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اگر لمحہ بھر کے لئے یہ سوچے۔ کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ اس کی ہستی کا مقصد کیا ہے۔ اس کا سینہ کس کے پیام ناز کا امین ہے اور اس مقصود امانت کے اتمام کے لئے اللہ جلشانہ نے اس کے دل و دماغ میں کیا طاقتیں۔ کیا قوتیں۔ ودیعت کردی ہیں۔ تو ذوقِ حقیقت ہے یقین ہے۔ کہ اس کی کیفیت زندگی میں عہد سلف کی قوت عمل پیدا کردے۔ اور یہ قوت عمل ضروری ہے۔ کہ اسے قعر ذلت سے نکال کر مجلس اقوام میں زمانہ سابق کی طرح پھر عزت و وقار کی مسند پر بٹھا دے۔
نظم میں جابجا انداز بیاں کی خوبی و لطافت۔ فصاحت و بلاغت شان و شوکت پڑھنے والوں کو اپنی سحرکاری سے مسحور کر لیتی ہے۔ جمعیت سے بیگانگی۔ بے ہمتی۔ اور رسوائی کے تذکرے۔ دل کو ایک ٹیس لگاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی چمنستان حجاز کی یاد۔ خانہ ساز کے مزے۔ ایک کیفیت سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ دلکش نغمے۔ سریلی صدائیں۔ کان میں جو پڑتی ہیں۔ انسان مست الست ہو جاتا ہے پھر اسے مکنات زندگی کی دلچسپ اور روح افزا تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ کہیں یہ صحرا ہے۔ کہیں محمل۔ کہیں قیس۔ اور کہیں لیلا۔ محفل بھی ہے ساقی بھی ہے مے بھی۔ مینا بھی۔ انسان کی قوت تسخیر کے شاندار اور دل بڑھا دینے والے

مرقعے شاعر کی جادو نفسی سے نئے نئے رنگوں میں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ ایک رنگ میں تو یہ ایک قطرہ کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ اور دوسرے رنگ میں سمجھ بے پایاں نظر آرہا ہے۔ جادو کی تاثیر سے ضعیف الاعتقاد اور سست پے مسلم دل میں ایمان کی پختگی۔ اور رگوں میں عمل کی حرارت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر جذبات انسانی کا ماہر فلسفی شاعر موقع دیکھ کر ایسے دلفروز اور ہنگامہ خیز جلوے پیش کر دیتا ہے۔ جو سوتوں کو بھی جگا دیں۔ بلکہ مردوں تک میں بھی جان ڈال دیں۔

شاعر تلامیذ الرحمٰن کے قابل فخر گروہ کا ایک مقتدر فرد ہے۔ اور اس میں کلام نہیں۔ کہ اس کی چشم بصیرت جو محض خدا کے برگزیدہ اصحاب کی وہبی خصوصیت ہے۔ استقبال کی ظلمات میں آب حیات کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ اور ایک عجب دلفریب کنایہ سے باتوں باتوں میں اس کا اشارہ کر جاتی ہے۔ اس خصوص میں اقبال کا پایہ بلند ہے۔ اور اس کا انداز بیان بے مثال۔

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے
اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اور

راز اس آتش نوائی کا میرے سینہ میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

اقبال کے دل کے آئینے میں جلوۂ تقدیر کا تماشا حیرت انگیز ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہوجائیگی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہوجائیگی
شبنم افشانی مری پیدا کریگی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائیگی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہوجائیگی
پھر دلوں کو یاد آجائیگا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائیگی
نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہوجائیگی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں۔ کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

یہ نظم جنگ عالمگیر سے دو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ مغربی جاہ و جلال، شوکت و تہذیب کے اثرات سے جو جنگ سبب ہیں۔ اور بعد از جنگ بھی نظر آرہے ہیں۔ کون ناواقف ہے۔ اقوام عالم میں بیداری۔ اور تقاضائے حریت اب کون نہیں دیکھتا۔ اور اسلامیوں کا رجوع الی۔ اور ذوق اخوت کہاں چھپ سکتا ہے اقبال کی آنکھوں نے یہ سب کچھ پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

جواب شکوہ

۱۹۱۲ء میں امداد مجروحین بلقان میں چندہ جمع کرنے کے لئے جواب شکوہ لکھا گیا۔ اور مجمع عام میں شہر لاہور کے موچی دروازہ کے باہر باغ میں پڑھا گیا۔ شکوہ مسلمانوں کے کارنامے۔ اعلائے کلمۃ اللہ۔ اور تبلیغ اسلام میں ان کی سرفروشیاں۔ اور خدا اور اس کے رسول کی راہ میں ان کی جان بازیاں بیان کرتا ہے۔ اور اس پر ذات باری کی بے نیازی کی شکایتیں ہیں۔

طعن اغیار ہے رسوائی و ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

اور پھر نظر التفات کی تمنا۔ اور استدعا ہے۔

پھر پتنگوں کو مذاق تپش اندوزی دے
برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

جواب شکوہ میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب۔ اور ان کی رسوائی اور ناداری کے بواعث مذکور ہیں۔ اور ان کی نامسلمان روش۔ اور کفر شعاری پر لوازیانہ ہیں۔ جو دل ہلا دیتی ہیں۔ اور پھر تہذیب نو کی ویران کاریوں سے متنبہ کرتے ہوئے رجوع ملی کی دل افزا جھلک دکھائی ہے۔ اور مسلمان کو خدائی آواز سے بتا دیا گیا ہے۔ اور یقین دلایا ہے کہ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

طرز بیان دل فریب ہے۔ مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے شاعر نے اپنے خیالات صدائے غیبی کی صورت میں ظاہر کرکے ان پر الٰہی مہر صداقت

لگادی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کے دربار بے نیازی سے مسلمانوں کو مخاطب کرکے بتایا گیا ہے اور ان کے سب شکووں اور شکایتوں کا جواب اسی میں ملتا ہے۔ کہ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں۔ کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے۔ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے۔ جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

ارشاد ہے۔ کہ مسلمان کس منہ سے شکایت کرسکتے ہیں۔ انہیں تو خدا کی طرف رجوع ہی نہیں۔ ادھر میل ہی نہیں۔ خیال کرنے کی بات ہے جب کوئی مانگنے والا ہی نہ ہو۔ دینے والا کسے دے۔ ان کے شکوے بے جا ہیں۔ یہ تو منزل کے رہرو ہی نہیں۔ راہ دکھانا ہو۔ تو کسے دکھایا جائے۔ ان کی دستگیری کیا۔ اور ان کی رہنمائی کیسی۔ اور تو اور ان میں انسانیت ہی نہیں رہی۔ انہیں آدمیت کس طرح سکھائی جائے۔ ربّانی تربیّت تو عام ہے۔ لیکن یہاں جوہر قابل ہی نہیں۔ اگر ان میں قابلیّت ہوتی۔ صلاحیّت ہوتی۔ تو اللہ کے خزانوں میں کیا کمی ہے۔ درگاہِ باری میں کس چیز کی پرواہ ہے۔ وہاں تو صرف اہلیّت شرط ہے۔ ہمّت اور عمل درکار ہے۔ ندائے غیب صریح الفاظ میں سنا رہی ہے۔

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

آج کل کے مسلمانوں کی تو یہ حالت ہے۔ کہ قوت عمل مفقود و دل الحاد سے خوگر بت شکنی چھوڑ کر بت گری پیشہ۔ بت پرستی شیوہ۔

بادہ آشام نئے - بادہ نیا - خم بھی نئے

حرم کعبہ نیا - بت بھی نئے - تم بھی نئے

ان کی نسبت اللہ سے لو لگانے کا ذکر ہی کیا - انہیں اس کی صبحگانہ یاد سے واسطہ ہی کیا - یہاں تو میٹھی میٹھی نیند پیاری ہے - اور صبح کی بیداری سخت گراں - نماز کیسی اور روزہ کہاں کا - طبع آزاد رمضان کی پابندیاں کیسے برداشت کر سکتی ہے - اور روزہ داری کی قیود کیوں اور کس طرح نباہے -

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی

برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسم اذاں - روح بلالی نہ رہی

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

وتیرہ تو یہ اور پھر اس پر دعوائے مسلمانی - اور وفاداری ناداں سمجھتے نہیں -

قوم مذہب سے ہے - مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

کون انکار کر سکتا ہے کہ قیود مذہبی قوموں کو ایک لڑی میں پرو کر ان کی ہستی ان کی زندگی کی کفیل ہوتی ہیں - اور مسلمان کی ہستی کا شیرازہ تو بالخصوص مذہب ہی کے جذب باہم سے قائم ہے - اور قائم رہ سکتا ہے -

دور حاضر کا مسلمان سلف کے کارناموں پر کیا ناز کر سکتا ہے کہاں وہ خدا اور رسول کا شیدائی - صداقت - عدل - حیا - اور شجاعت کا دلدادہ

امر کا آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا

جو بھروسہ تھا اُسے قوتِ بازو پر تھا

غیور۔ خود دار۔ اخوّت پر نثار۔ اور سراپا کردار۔ اور کہاں یہ شعارِ اغیار کا فدائی۔ وضع میں نصاریٰ۔ تمدّن میں ہنود۔ ذوقِ تن آسانی میں مست۔ تارکِ قرآں۔ خودکشی شیوہ۔ اخوّت سے گریزاں۔ اور سراپا گفتار۔ علمِ حاضر میں مہارت ان کا مایۂ ناز۔ زیارتِ لنڈن اس کے مذہب میں حجِ اکبر۔ چند روزہ ٹھاٹھ کا مفتوں۔ بے عمل۔ سست عقیدت۔ آوارگی کے فریفتہ۔ مے خواری کے دلباختہ۔ تعشق کے والہ۔ اور بے پردگی کے شیدا۔

مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بُتِ ہندی کی محبّت میں برہمن بھی ہوئے
شوقِ پرواز میں مہجورِ نشیمن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے
ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

مسلمانوں کی اس خس و خاشاک صفت زندگی۔ اور عہدِ نو کی برق فگنی پر انہیں متنبہ کیا گیا ہے۔

عہدِ نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملّتِ ختمِ رسُل شعلہ بہ پیراہن ہے

لیکن ساتھ ہی صاف و صریح الفاظ میں انہیں بتا بھی دیا ہے کہ ان شعلہ سامانیوں میں بھی اگر ایمان کی دولت میسّر ہو۔ تو کوئی خوف کی بات نہیں۔ یہی شعلے۔

یہی آگ - گل و گلزار ہو سکتی ہے۔

آج بھی ہو جو ابراہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

قوت ایمان - اور قوت عمل کی ضرورت ہے۔ اگر یہ حاصل ہوں - تو پھر مایوسی اور پریشانی کی کوئی وجہ نہیں - اور ندائے غیبی یہ امر مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے پر زور دیتی ہے - اور لو یہ سناتی ہے۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

انہیں بتایا گیا ہے کہ۔

نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

مسلمانوں کو مختلف ممالک میں جو مصائب پیش آئے - اور ان کی حکومتیں جو یکے بعد دیگرے اقوام غالب کی دستبرد سے مٹنے کے آثار دکھانے لگیں - اقبال کے دل پر ان کا عجیب اثر ہوا - اور فی الحقیقت یہی واقعات تھے - جنہوں نے ان کے زاویہ نگاہ کو - کلیتاً بدل دیا - سیر یورپ میں غیر اقوام کی چالبازیوں نے ان کی آنکھیں کھول دیں - وہ دیکھتے تھے - کہ مسلمان نرغہ میں آگئے ہیں - اور ان کا بچاؤ اگر ہے - تو اس میں کہ اپنے پرانے اسلامی عقائد و اعمال پر کاربند ہو جائیں وطنیت کی پابندیوں سے آزاد ہوں - اور اسلام اور محض اسلام کی شیرازہ بندی میں منسلک ہوں - مطلق شعار اسلامی اختیار کریں - اور سرد دلوں کو عالمگیر اخوت اسلامی کی گرم جوشیوں سے گرما دیں - اور مصائب و آلام دنیاوی سے بے پرواہ ہو کر خدا اور رسول عربیؐ کی شیفتگی میں منہمک ہو جائیں۔

جنگ بلقان سے شاعر کے تخیل میں سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا۔ اور ہمدائے غیب سے مسلمانوں کو خطاب کرکے انہیں حوصلہ دلایا۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکیگا نفسِ اعدا سے

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے۔ کہ موجودہ اسلامی سلطنتوں کی تباہی۔ اسلام اور اسلامیوں کی تباہی نہیں۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور تاریخ کے حوالے سے تاتاریوں کی یورش کے حوالہ سے اس امر کو واضح کیا گیا ہے۔ اگر کبھی کسی غیر مسلم قوم نے اسلامی سلطنت پر غلبہ پاکر اسے تہ و بالا کر بھی دیا۔ تو وہی قوم خود حامی اسلام بن کر اسلام اور اسلامیوں کا ایک زبردست بازو بن گئی۔ اور اس حقیقت کا راز یوں ظاہر کیا گیا ہے۔

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

ایرانیوں کی تباہی۔ یا بلغاریوں کی فتوحات۔ اور ترکوں کی ہزیمت اور خستہ حالی ایسی گھبرانے والی باتیں نہیں۔ اور نہ ہی انہیں مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان تصوّر کرنا چاہیئے۔ چشمِ غور سے دیکھا جائے۔ تو ایسے واقعات غافلوں کے لئے پیغامِ بیداری۔ اور مسلمانوں کے لئے ایثار و خودداری کا امتحان ہیں۔ اور اس سے زیادہ ان کی کچھ اصلیت نہیں۔ اسلامی سلطنتوں

کا نزول مسلمانوں کی افسردگی کا باعث نہیں ہونا چاہئے۔ خدائی وعدہ ہے۔

نورِ حق بجھ نہ سکیگا نفس اعدا سے

نورِ توحید کے اتمام کے لئے محفلِ ہستی کو ابھی مسلمانوں کے وجود کی ضرورت ہے۔ اور اسی کی حرارت زمانہ کی زندگی کی کفیل ہے۔ شاید اسے خبر نہیں۔ اور یقیناً نہیں۔ کہ اس کی ہستی حکومت سے وابستہ نہیں محض راز توحید ہی اس کی ہستی کی تفسیر ہے۔ اور اسی لئے مسلمان کو ندائے غیب نے پیغام خودی اور عمل کا یوں دیا ہے۔

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوشِ ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

درگاہ ایزدی سے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ یہ نام صلِ علیٰ ۔ وہ نام ہے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامن کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلماں کے ایمان میں ہے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

مردم چشم زمیں، یعنے وہ کالی دنیا
وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

سبحان اللہ۔ نعتیہ لہجہ۔ اور اللہ جل شانہ کی زبان میں۔ کیا ہی لطف دے رہا ہے۔ شکوہ کی شکایتیں۔ شکایتوں کا جواب۔ چاہے کچھ ہوں۔ اخیر میں شاعر کے جذبات ملی نے آسماں سے یہ آواز دل ہلا دینے والی آواز مردوں میں جان ڈالنے والی آواز سنی ہے۔

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

خضرِ راہ حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۲ء میں خضرِ راہ پڑھی گئی۔ شمع و شاعر کی بلند پروازیاں اور مضمون آفرینیاں اس میں نہیں۔ البتہ حالات حاضرہ پر نکتہ آفرینیاں ہیں۔ اور زمانہ حال کی سیاسیات پر ایک معنی خیز تبصرہ اس کے مطالب سادہ زبان۔ اور وضاحت بیان سے قبولیت عام کی سند حاصل کرنے میں شمع و شاعر سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔

ان مطالب کی تلقین حضرت خضرؑ کی زبانی ہے۔ اور اس تلقین کے لئے حضرت خضرؑ کی رہنمائی کا انتخاب۔ بلحاظ مضامین نظم نہایت ہی موزوں ہے اس نظم میں شاعر کو حالات حاضرہ پر اپنے خیالات کا اظہار مقصود تھا۔ اور حالات کی اہمیت متقاضی تھی۔ کہ ان کے بیان کا انداز اسناد کی تائید لئے ہوئے تاثیر کا کفیل ہو کشمکش وجودی۔ سلطنت اور حکومت کے لئے قوموں کا تصادم۔ محنت اور سرمایہ کی جدوجہد۔ اور سب سے بڑھ کر اسلامیوں کی شیرازہ بندی میں انتشار۔ ایسے سوالات ہیں۔ جو اس وقت ساری دنیا میں ہل چل مچا رہے ہیں۔ اور ان سوالات پر حضرت خضرؑ کے سوا۔ جو اپنے امتداد زمانہ کے وسیع تجربہ سے۔ زندگی کے اصل اصول۔ اس کے نشیب و فراز۔ قوموں اور سلطنتوں کے عروج و زوال محنت اور سرمایہ کی حقیقت۔ اسلامیوں کی حالت۔ ہر بہترین اور مکمل ترین واقفیت رکھنے کے مستحق ہیں۔ اور کون ہو سکتا تھا جس کے اسناد سے ایسے مشکل اور وقت طلب سوالات کے حل کرنے میں سعی کی جاتی اور زیادہ تر حالات حاضرہ کے آئینہ میں استقبال کی صورت دیکھنے اور دکھانے کے لیئے حضرت خضرؑ کے پایہ کے رہبر کی ہی رہنمائی درکار تھی۔

جو روایت نے حضرت موسیٰؑ ایسے عظیم بالشان پیغمبر کے لئے بھی ناگزیر قرار دی ہے
اقبال کے تخیل نے حضرت خضرؑ کو آپ کے قدیمی سیرگاہ ساحل دریا پر
مخاطب کیا ہے۔ خوبی بیان کسی شرح کی محتاج نہیں۔

حضرت خضرؑ سے ملاقات کا موقع میسّر ہونا سہل نہیں۔ مقام۔ وقت اور حالات شرط ہیں۔ دریا کا کنارہ ہے۔ رات کا وقت ہے۔ ہُو کا عالم۔ تاریکی شب نے سکوت کو دوبالا کر دیا ہے۔ ہوا بھی رُک رُک کر چلتی ہے۔ اور دریا کی رَو میں بھی سکون کی یہ صورت ہے۔ کہ دریا پر پانی کی بے حس و حرکت تصویر کا دھوکہ ہوتا ہے۔ سطح آب پر اضطرار صفت موج کہیں نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی وقت کے تقاضے سے اس شیر خوار بچّہ کی طرح جو گہوارہ میں سو گیا ہو۔ دریا کی گہرائیوں میں مست خواب ہے۔ رات کا جادو اثر منتر طائروں کو ان کے آشیانوں میں نیند کی قید میں ڈالے ہوئے ہے۔ اور چاند نے اپنی روشنی کے طلسم سے غریب مدہم چمکنے والے ستاروں کو اور بھی مدہم کر دیا ہے۔ اس تنہائی اور خاموشی کے منظر میں شاعر کا دل دنیا بھر کی پریشانیوں سے مضطرب۔ رہنمائی کا طلبگار ہو رہا ہے۔ حضرت خضرؑ سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور

چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب

کہہ کر شاعر کی جستجو کی زبان کھول دیتے ہیں۔ اور وہ حالات حاضرہ کی پریشان کرنے والی گتھی آپ کے سامنے رکھ کر عقدہ کشائی کا طلبگار ہوتا ہے۔

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محروم آبِ زندگی
فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ایک زمانہ وہ تھا۔ کہ کلیم اللہ کی شان کا پیغمبر حضرت خضر کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اور آپ ان کے "کشتیٔ مسکین" "جانِ پاک" اور "دیوارِ یتیم" کے متعلق استفسارات پر برہم ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں اپنے ہمراہ رکھنے سے بیزاری دکھاتے ہیں۔ اور اب بیسویں صدی عیسوی میں ایک فلسفی مسلمان شاعر کے سحر آفرین تخیل کا اثر دیکھئے۔ کہ وہ زندگی اور دورِ حاضر کے اہم مسائل پر گفتگو چھیڑتا ہے۔ اور آپ اس کے ذوقِ راز جوئی سے مصلحتاً نہیں گھبراتے۔ بلکہ بڑی توجہ سے اس کے سوالات سنتے ہیں۔ اور بڑی تفصیل سے اسے جواب دیتے ہیں خاقانی اور نظامی کو بھی حضرت خضر سے ایسی ہی ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے لیکن ان کی ملاقاتوں میں وہ بے تکلفی نہیں۔ گفتگو میں وہ کشادہ دلی نہیں تعلیم و تعلم میں وہ فراخ حوصلگی نہیں۔ یہاں ایک طرف تو دنیا کے مہمات امور ہیں۔ راز جوئی کی سلسلہ جنبانیاں ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے انکشافات ہیں دل کھول کر حقیقت ترجمانیاں ہیں۔ شاعر کی یہ جسارت اور حضرت خضر کی یہ عنایت اہل مذاق کی خاص توجہ کے قابل ہے۔

شاعر حیران ہے۔ اور پوچھتا ہے۔

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد

زندگی کیا چیز ہے؟ اور بالخصوص آپ کی اس طرز زندگی کا کیا راز ہے؟۔

حضرت خضرؑ کی زبان نے یہ راز عجب لطافت سے منکشف کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ صحرا نوردی میں حقیقت زندگی مضمر ہے۔ صحرا نوردی کی "تگا پوئے دمادم" زندگی کی دلیل ہے۔ یہی "تگا پو" زندگی ہے۔ اور اسی "تگاپو" میں زندگی ہے۔ اس راز کے مزے کچھ وہی لوگ جانتے ہیں۔ جنہیں اللہ نے اس "تگا پوئے دمادم" کی ہمت اور توفیق دی ہے۔ جمود و سکون کے متوالے کیا جانیں۔ وہ تو اس لطف سے محض ناآشنا ہیں۔ جو اس تگ و دو میں زندگی کے دلفریب اور سبق آموز مراحل طے کرنے میں حاصل ہوتا ہے۔ فضائے وشت میں بانگ رحیل کی گونج کا سماں نئے دن نئی منزل کی جستجو میں سعی کی گامزنی، مختلف مراحل پر خیمے ماندوں کا جاری چشموں کے گرد مقام بے پرواہی کا اچھلنا کودنا بے برگ و سامانی کی سیر چشمی۔ صبح کے ستارے کی ضیا پاش جبیں۔ اور سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب کا شان کبریائی دکھانے والا انداز۔ ایسے دلکش نظارے ہیں۔ جو کسی اہل خانہ کے خواب میں بھی نہیں آئے۔ اور نہیں آسکتے۔ اور یہ نظارے صرف دلکش ہی نہیں۔ بلکہ حقانیت کے جلوے دکھاتے ہیں۔ انہیں تو خلیل اللہؑ جیسے عالی جاہ اور بلند مرتبت پیغمبر کو بھی منزل مقصود کی سیدھی راہ بتانے کا فخر حاصل ہے۔ دراصل یہ "تگا پوئے دمادم" سودائے محبت کی دلیل ہے۔ اور سودائے محبت بھی جوہر دم تازہ ویرانے کی تلاش میں ہے۔ آبادیوں میں رہنے والے کثرت و تخیل کے پابند سودائے محبت کی اس نعمت سے

محروم ہیں۔ اور انہیں معلوم نہیں کہ

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

دوامِ زندگی کا راز "تگاپوئے دمادم" یا گردشِ پیہم میں ہے۔ اور یہ تگاپو اور گردش ان کی توفیق اس وقت نصیب ہوتی ہے۔ جب دل میں سودائے محبّت ہو۔ کیونکہ پھر یقینی امر ہے۔ کہ سودائے محبّت کو دمبدم تازہ ویرانے کی تلاش ہوگی۔ اور اس طرح "تگاپوئے دمادم" اور سلسلۂ دوامِ زندگی قائم رہ سکیگا۔

صحرانوردی کی حقیقت تو یہ ہے لیکن زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ اس مضمون پر بھی حضرت خضرؑ نے حکمت کے خزانے کھول کر رکھ دئے ہیں۔ اور لطافت کے موتیوں کی لڑیاں پرودی ہیں۔ زندگی عرف عام میں جان ہے مگر غور سے دیکھا جاوے۔ تو زندگی جان کے ہونے یا نہ ہونے سے وابستہ نہیں۔ جان کے عدم یا وجود پر موقوف نہیں بعض اوقات جان دیدینا بھی اعلیٰ درجہ کی زندگی ظاہر کرتا ہے۔ زندگی قیودِ زمانی سے آزاد ہے۔ یہ محض ایام گذاری نہیں۔ بلکہ

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

زندگی۔ انفرادی زندگی۔ ایک فردِ واحد کی زندگی بھی۔ اپنی مساعی کی وسعت کے مطابق۔ اپنی ایک نئی دنیا بنا سکتی ہے۔ اور اس حقیقت کا کوہکن کے دل کی ہنگامہ آرائیوں سے پتہ چلتا ہے۔ کوہکن کے دل میں محبّت کی آفرینش۔ محبوب کا ہر دم پیش نظر رہنا۔ طلب وصال شیریں میں تیشۂ محنت وجفاکشی سے موانعات کے سنگِ گراں کا پاش پاش کرنا۔ اور اس سعی میں بظاہر ناممکن الوقوع وسائل سے حصول مطلب پر حاوی

ہونے کا استقلال قائم رکھنا۔ زندگی ہے۔ اور کون نہیں سمجھتا۔ کہ اپنی ایک نئی دنیا بنا لینا ہے جس میں محبت۔ محنت۔ جفاکشی۔ اور امید مایہ حیات ہیں۔ اور محبت کا سودائی حیات کی اس موہنی صورت پر زیست کی اس دلبریا ادائی پر ہزار جان سے قربان ہے۔ اور اسی میں مست اور محو ہے۔

البتہ حقیقی زندگی کے بہتر ہونے کے لئے آزادی لابدی ہے بندگی میں زندگی کا وادی عمل کی پابندیوں سے محدود ہو کر اسے ایک پایاب نہر کی سی تنگ ظرفی کا راستہ بنا دیتا ہے اور اگر آزادی نصیب ہو۔ تو اس کی جولانیوں کا میدان بحر بیکران کی امواج کی شان و شوکت دکھاتا ہے۔ وجود انسانی کی مٹی کی مورت میں زندگی کی قوت تسخیر کے کرشمے ایک عالم حیرت کے تماشے دکھا سکتے ہیں۔ لیکن یہی مورتی جب تک خام ہے سوائے تو وہ خاک کے کچھ بھی نہیں۔ ہاں! پختہ ہو جائے تو پھر اسی مٹی کی مورتی میں شمشیر بے زنہار کی طاقتیں نظر آئینگی۔ زندگی اس زیان خانہ دنیا میں انسان کا امتحان ہے۔ اور اس امتحان میں پورا اُترنے کے لئے پختہ کاری درکار اور ضروری ہے۔ ہمارے خضر راہ کا فرمان ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اور آگے چل کر صاف و صریح الفاظ میں پیغام عمل کے اصول کو ایک نئے انداز سے دوہرایا ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب
تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

دوسرا سوال سلطنت کیا چیز ہے۔ حضرت خضر کے جواب کا منتظر تھا۔ اور اس جواب میں سلطنت۔ جمہوریت مغربی۔ مجلس آئین۔ اصلاحات۔ رعایات و حقوق کی حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا ہے۔ جو ایک نکتہ رس نگاہ سے کسی صورت میں بھی چھپ نہ سکتی تھی۔ سلطنت۔ خضرِ راہ کی زبان میں۔ اقوامِ غالب کی اک جادوگری ہے۔ جو مغلوب قوموں کو ہر وقت بے ہوش رکھنے میں ساعی ہے۔ اور اگر محکوم کبھی اس خوابِ بیہوشی سے ذرا بیدار ہونے لگتا ہے۔ تو سامری فن حکمران فوراً اُسے پھر سُلا دیتا ہے۔ اس سحر کا کمال یہ ہے۔ کہ محکوم کی آنکھیں حکومت کے حلقوں میں اپنی زیب و زینت دیکھتی ہیں۔ مگر یہ جادو دیرپا کام نہیں دے سکتا قیصریت کو دوام ممکن نہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

بتایا گیا ہے۔ کہ غلامی میں فطرت کی رسوائی ہے۔ اور بالآخر قیصریت کا طلسم توڑنے کے لئے اللہ کے بندے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو مغرب کا جمہوری نظام بھی

قیصریت کا غلبہ وار ہے۔ اور

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق

صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ اور دھوکے کی ٹٹی ۔

طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

مجالس حکومتی میں ارکان حکومت کی گرمی گفتار سرمایہ داروں کی جنگ زرگری ہے۔
اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ان حالات میں ہمیں متنبہ کیا گیا ہے۔

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو

آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

تیسرے سوال کے جواب میں سرمایہ و محنت کی کشمکش پر فصیح و بلیغ اشعار ہیں۔ سرمایہ داروں کی چالبازیاں اور مزدور کی زیاں کاریاں اک نئے انداز سے بیان کی گئی ہیں۔ سرمایہ داری کا تغلب۔ اور عالمگیر نصرف مزدور کی صداقت پسندی اور ابلہانہ خود فروشی۔ اس قدامت پسندی کے سلسلے میں اس کا جھوٹے خون آشام دیوتاؤں کے قدموں پر جان وارنا۔ اور اس خود فروشی کی ترنگ میں سرمایہ داری کے نئے نئے مسکرات کے نشے میں سرشار جان پر کھیل جانا اور اس سارے تماشے میں اس سادہ لوح کا یہ نہ سمجھنا کہ کیا کھیل ہو رہا ہے۔ اور پانسہ کدھر پڑ رہا ہے۔ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ اور اس کا خون بوند بوند تک چوسا جاتا ہے۔

حالات۔ سرمایہ داری۔ اور محنت کی یہ کیفیات حضرت خضرؑ ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ ان کی پیغمبری نظر حقیقت سے آگاہ ہے۔ انہوں نے واقعات جیسے پائے۔ جیسے سمجھے۔ بیان کئے ہیں۔ حالات وہ دیکھتے ہیں کہ دل شکن

اور قابلِ ہمدردی ہیں۔ ان کی ہمدردی مزدور کے ساتھ ہے۔ مگر وہ دل شکستہ نہیں ہوتے۔ اور ان کی ہمدردی مزدور کے مستقبل کامرانی کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ مزدور کو ان کا پیام ہے۔

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس مژدہ جانفزا سے مزدور کو ہمت بلند رکھنے۔ زر و سیم کی پرستاری سے آزادی حاصل کرنے۔ اور نغمہ بیداری جمہور سے سرخوش ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اور خودی اور خود افزائی کی تلقین کی ہے۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

آخری سوال ہی ساری نظم کی جان ہے۔ اور اس کا جواب مکالمہ کی روح رواں اگرچہ سوال کا پہلا حصہ ظاہری الفاظ میں کل برّاعظم ایشیا پر حاوی ہے لیکن بعد کے اشعار سے عیاں ہے کہ شاعر کے ذہن میں۔ وسط ایشیا ہی جو دنیائے اسلام کی پشت و پناہ ہے۔ اس کے جذبات شاعری کا باعث ہوا ہے۔ اور حضرت خضر ع نے بھی شاعر کا دلی منشاء نظر رکھ کر جواب میں ترک و عرب کی داستان کا ہی حوالہ دیا ہے۔ داستان دردناک ہے۔ اور دردناک الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس
وہ مۓ سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آبِ ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے، تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

حضرت خضر نے ظلمات کی اس اندھیری رات میں جو اسلامیوں پر چاروں طرف سے چھائی ہوئی ہے۔ آب حیات کی جھلک دیکھی ہے۔ اور سوال کرنے والے کے اضطراب کو دور کرنے کے لئے اسے امید کا سہارا دیا ہے۔ اسے بتایا ہے کہ اسلامیوں کی خانہ ویرانی۔ ان کی تباہی۔ ان کی بربادی کسی طرح گھبراہٹ اور پریشانی کا باعث نہیں ہونی چاہئیں۔ کیونکہ دستور ہے۔ اور مولانا روم جیسے بزرگ بھی کہہ گئے ہیں۔

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

ظاہر ہے کہ نئی تعمیر کے لئے پرانے کھنڈرات کا اکھاڑ ڈالنا ضروری ہے۔ اور نئے نظام قائم کرنے کے واسطے سابقہ متزلزل نظم و نسق کا استیصال اگرچہ اسلامی سلطنتوں کی شکست ریخت۔ ترکوں۔ عربوں۔ اور ایرانیوں کی ذلت و رسوائی مسلمانوں کے لئے رنج و ملال کے واقعات نہیں۔ بلکہ انہیں ان واقعات سے سبق حاصل کر کے نئی شیرازہ بندی۔ نئی طاقت۔ اور نئی روح سے اپنے پرانے اسلامی اصولوں پر استحکام و استقلال ملی کی بنیادیں قائم کرنی ہونگی اور یہی ایک صورت ہے جس میں مسلمانوں۔ اور ایشیا والوں کی نجات ممکن ہے۔

واقعات متقاضی ہیں۔ کہ مسلمان اخوت اسلامی کی خدائی رسی سے سب کے سب وابستہ ہو جائیں۔ اور دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ربط و ضبط ملت کر کے اغیار کی امداد اور استحسان سے بے نیاز ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے۔ کہ ملک و دولت اسلام کا مقصد یا اسلامیوں کا مطمح نظر نہ کبھی تھا۔ اور نہ ہونا چاہیئے۔ اسلام کی تلقین کے رو سے تو انسان خلیفۃ اللہ کی حیثیت میں دنیا میں آیا ہے۔ اور اس کی ہستی اور اس کے وجود کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ خلافت الٰہی کی بنا یہاں قائم کرے۔ اعلائے کلمۃ اللہ۔ اور اشاعت حق میں اسلاف کے قلب و جگر سے کمر بستہ ہو جائے۔ اسلامیوں کا حصار دین ہے۔ اور مسلم خلافت الٰہیہ کا امین۔ ملک و دولت اس کی زندگی کا مقصد نہیں۔ اور مسلم کے قیام و دوام کے واسطے مذہب اور فقط مذہب اصل اصول ہے اور تفریقات باہمی امتیاز نسل۔ رنگ اور خون۔ اس کی ہستی کے منافی ہیں۔

آخری بند اسلامیوں کو پھر وہی امید کی جھلک دکھاتا ہے۔ اور زمانہ حاضرہ کی مغربی جبروت و سطوت کا مآل تباہی و بربادی میں دیکھتا ہے۔ اور مسلمانوں کو خوشخبری سناتا ہے۔ کہ اسلام نے جس عام حریت کی آبیاری کی تھی۔ آج کل کی جمہوریت کی موجوں میں جو دنیا بھر میں ایک طوفان بپا کئے ہوئے ہیں۔ اس کی تکمیل ہوتی نظر آرہی ہے۔ پرانے ویرانوں میں نئی آبادیاں بنانا زمانہ کا شعار ہے۔ اور مسلمان کو جو تقدیر کا قائل اور شیدا۔ اللہ کے وعدوں کا عقیدت مند۔ اور دلدادہ ہے۔ صورت ویرانی سے پریشان خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کی آئندہ کی زندگی۔ ان ویرانیوں میں بھی۔ شاداب ہوگی۔ اور اس کا مستقبل۔

ان تباہیوں میں بھی۔ شاندار ہوگا۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس بند میں شاعر نے اپنا انداز بیان بدل لیا ہے۔ فریاد کا خاتمہ ہے۔ اور اب خاموشی سے فریاد کی تاثیر کا انتظار ہے اور مسلمان کو سمجھایا گیا ہے۔

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اور

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

کلام کیا ہے غیب کی ندا ہے۔ آنے والے واقعات کی نسبت پیشینگوئی ہے۔ جو شاعر کی چشم تخیل۔ فطرت شاعری کی پیغمبری جزو پس پردہ دیکھ رہی ہے۔ پیشین گوئی کہاں تک صحیح ثابت ہوئی۔ ایک سال کی قلیل مدت نے ظاہر کر دیا۔ اقبال کا حقیقت آشنا دل جو وقت کے پردہ کے پیچھے سال بھر پہلے دیکھ رہا تھا۔ سال کے اندر ہی کارکنان قضا و قدر نے نگاہ عامیانہ کے لئے بھی بے نقاب کر دیا۔ اور زمانہ نے دیکھ لیا۔

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامان وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ

ترکان احرار دیکھنے کو تباہ ہو گئے۔ ان کی حکومت۔ ان کی جمعیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ یوروپ کا لاڈلا قسطنطنیہ یونان کیل کانٹے سے سجا کر ایشیائے کوچک میں

دھکیل دیا گیا۔ وہ جہاں گیا قتل و غارت اس کے ہمراہ گئے۔ اس نے جدھر رخ کیا وحشت اور خونخواری اس کے ساتھ ساتھ پہنچے لیکن اس تباہی میں۔ اس خاتمہ پر بھی اس قتل و غارت۔ اس وحشت و خونخواری میں بھی دل دادگان مصطفےٰ ص کی زندگی کی برقی لہروں نے کمال کی دلیری اور سرفروشیوں سے دنیا کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اور فرنگی تدبیر تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔ یونان ذلیل اور خوار ہو کر سرزمین ایشیاے کوچک سے نکال دیا گیا۔ اور ترکان احرار اپنی چھوٹی سی آزاد سلطنت کے جوان کے بازو کی ہمت و ان کے دل کی جسارت نے انگورا میں قائم کی ہے مالک ہیں اور اللہ کی اس عنایت پر نازاں بھی ہیں

طلوع اسلام شاعر نے حالات حاضرہ سے متاثر ہو کر فریاد چھوڑ دی۔ اور آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر "طلوع اسلام" میں کھینچنے کی کوشش کی۔ "طلوع اسلام" مارچ ۱۹۲۳ء کے آخری دن انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ ہزارہا مسلمان اپنے قومی شاعر کی جادو بیانی کے شیدائی اسلامیہ کالج کے وسیع میدان میں عقیدت کی آنکھیں کھولے۔ اور ارادت کے کان لگائے۔ "طلوع اسلام" کے منتظر تھے۔ شاعر نے اپنی سحر فنی سے امید کی کرن کے دلفروز مناظر دکھائے۔ اور قوم کے خوابیدہ جسم میں کہیں کہیں آثار بیداری کے کرشمے ایک عجیب دلربایانہ انداز میں ادا کئے۔ اس نظم میں شمع و شاعر کا سوز و گداز اور خضر راہ کی تلقین نہیں۔ اور نہ ہی اس میں وہ تپش اور تڑپ ہے۔ جو ان دونوں نظموں کی خصوصیت ہے۔ اور اس کے لئے وجوہات ہیں۔ فریاد کا خاتمہ ہے۔ فریاد کی تاثیر۔ اور امید کی دل افزا کیفیتیں طلوع اسلام میں جلوہ پیرا ہیں۔ مایوسیوں کی گھٹائیں جو چاروں طرف سے مسلمانوں کو گھیرے ہوئی تھیں۔ حالات حاضرہ کی روشنی میں کھلتی نظر آتی ہیں۔ مطلع صاف ہو رہا ہے۔ منزل کے دھندلے سے نشانات سامنے دکھائی دینے لگے ہیں۔ دل میں امنگیں موجزن ہیں۔

اور منزل کے قریب پہنچ جانے کے شوق نے تگ و دو کی تلخ نوائی میں اب سرور کی لے پیدا کر دی ہے۔ اور سعی کی تڑپ میں انبساط کی لہریں نمودار ہو رہی ہیں۔ اقبال کا دل احساسات سے لبریز ہے۔ تاثرات اس کے اندر ایک ہنگامہ بپا کر دیتے ہیں۔ جذبات قیامتیں لے آتے ہیں۔ اس کے احساسات پر جوش ہوتے ہیں۔ اور اس کے جذبات تیز۔ کوئی خیال جو اس کے سینہ میں موج زن ہو طوفان لے آتا ہے۔ کوئی واقعہ جو اس کی بصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے۔ اس کے دل میں کیفیت سرور پیدا کر دیتا ہے۔

جنگ عالمگیر کے نتیجہ خیز انقلابات اقبال نے دیکھے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے آنے والے حالات بھی استقبال کے پردے میں اسے نظر آ رہے ہیں۔ جادو کے قلم نے احساسات شاعر کی تصویر کھینچی ہے۔ تہذیب حاضرہ کی ویران کاریاں اور شاندار مادیت کی بے چارگی دیکھ کر شاعر کا حق جو اور حق نما دل دنیا پر اس حقیقت کے اظہار میں اچھل رہا ہے۔ اور اپنے احساسات سے سامعین اور ناظرین کے دلوں میں لطیف جذبات پیدا کرتا ہے۔ اقبال شاداں اور فرحاں ہے۔ اور اس کی مسرت اپنی رنگیں بیانیوں سے اس کی فرحت اپنی سحر کار اداؤں سے تسخیر قلوب کر رہی ہیں۔

عثمانیوں کی کہنہ سلطنت کا زوال اور اس کے کھنڈرات پر جوانان تتاری کا عالیشان ایوان حکومت چشم بینا کے سامنے عبرت خیز اور دلکش مناظر پیش کر رہے ہیں۔ دنیائے اسلام جاگ اٹھی ہے۔ حکومت اسلامیہ کی تنک تاب ہستیاں۔ دور گراں خوابی کا خاتمہ اور مہر عالمتاب کی آمد آمد بتا رہی ہیں۔ عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی کا دوران پھر جاری ہو چلا ہے۔ مغرب کے طوفان نے اسلامیوں میں وہ جوہر پیدا کئے ہیں۔ کہ خود طوفان ان کی آب و تاب سے

آگے شرمندہ ہو رہا ہے۔ شاعر محسوس کرتا ہے۔ اور زور سے محسوس کرتا ہے۔ کہ

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے

شکوہ ترکمانی۔ ذہن ہندی۔ نطق اعرابی

اور اپنے اس روح پرور احساس کے جوش میں سوتوں کو جگانے کے لئے مسلمانوں کی گراں خوابی کے نشہ کو جہاں کہیں ہو اور جس قدر ہو۔ دور کرنے کے لئے سوز کے نغمے چھیڑتا ہے۔ اور ہم صفیروں کو اپنے ساتھ ہمنوا ہونے کے لئے کہتا ہے۔

نوا را تلخ ترمے زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

اور امید کرتا ہے۔ کہ صحن چمن میں۔ آشیانوں میں۔ شاخساروں میں۔ گلزار مصطفوی کے ایک ایک گوشہ میں فطرت کی تڑپ اور ہم مچا دیگی۔ اور حقیقت آشنائی کی جگرتابی ذرّے ذرّے کو شہید جستجو کر دیگی۔ قدرت اپنے کارخانہ کا راز اس کی آنکھوں کے سامنے جلوہ افروز کر رہی ہے۔ وہ مشاہدہ کرتا ہے۔

سرِشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا

خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے

یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

شاعر دیکھتا ہے۔ کہ نئے سلسلۂ حیات میں ستاروں کی ترکتازی نے ہمسایوں تک کو بھی جگا دیا ہے۔ اور وہ بھی سکون کی منزل چھوڑ کر ترقی کی راہ میں اپنے دیدہ ور ہمسفروں کے ساتھ ساتھ ہو لئے ہیں۔ اور اس مرحلہ حیات قومی پر پردۂ راز زندگی کو دیکھا چاہتا ہے۔ اور مسلمانوں کو ان کی نئی زندگی کے اس امید افزا دور میں سوز و ساز زندگی سے مسرور کر کے ترقی کے منازل اعلیٰ پر پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

مسلم کے دل پر اس حقیقت کا نقش بٹھانے کی کوشش ہے۔ کہ اس کی فطرت ممکنات زندگی کی امین ہے۔ دنیا کی خلافت اُس کا حصّہ ہے۔ اور فرش سے لے کر عرش تک اگر یہ پسند کرے۔ اُس کی قوت تسخیر کا گرویدہ ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

لیکن اس رتبہ کی شان اُسی وقت نمایاں ہو سکتی ہے۔ یہ قوتیں اُسی وقت اپنے جوہر دکھا سکتی ہیں جب اس مٹی کی مورت میں ذوقِ یقین پیدا ہو۔ ایمان کی روشنی اس کے ذرّے ذرّے کو منور کر دے۔ اقبال ہمیں کھلے الفاظ میں فرما رہے ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اگر غور سے دیکھا جائے۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یہ سچ ہے توفیق ایمان کوئی سہل امر نہیں یقین کی دولت کا ملنا آسان نہیں۔ ہوا و ہوس ایمان کی دشمن ہیں۔ اور اپنے معبودوں کی بھرمار سے انسان کے سینے میں ایمان کے لئے گنجائش نہیں چھوڑتیں۔ آدمی دن رات ہوس کا بندہ حرص کا پجاری۔ خواہشات کی پیروی میں منہمک ہے۔ اور ایمان سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ کفر۔

اگر یہ شک نہ کرے مغلوب گماں شد ہے۔ تو خود اس کا دل اسے بتا دیگا

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے

اس حقیقت کے انکشاف سے شاعر کا منشاء مسلم کی زندگی کا دستور العمل قرار دینا ہے۔ اس اہم کام کے جملہ مراتب پر ایک نظر ڈالنا۔ اور مسلم کے دل پر اُن کا نقش کرنا بھاری ذمہ واری ہے لیکن اقبال اس ذمہ واری کو محسوس کرتا ہے اور اس احساس کے جوش میں شوکت بیان کی خوبیات سے فائدہ اُٹھا کر سینوں میں آگ لگا دیتا ہے۔ اور دلوں میں کیفیتوں کی رستخیز پیدا کر دیتا ہے۔ اقبال مسلم کو مخاطب کر رہا ہے۔ خود یقین رکھتا ہے۔ اور اپنے سامعین اور قارئین کو یقین دلانا چاہتا ہے۔

یہ نکتہ سرگذشت ملت بیضا سے ہے پیدا

کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

صرف یہاں تک ہی محدود نہیں۔ وعدۂ الٰہی۔ وعدۂ خلافت بھی اس کے دل میں منقوش ہے۔ اور اس بار امانت کے اُٹھانے کے لئے ہمارا خداپرست شاعر مسلم کو تلقین کرتا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور اس امامت کے فرائض منصبی ادا کرنے کے لئے۔ اخوت، یقین، اور احساس ملی ضروری امور ہیں۔ اور اگر یہ حاصل ہو جائیں۔ تو جہاد زندگانی میں ذوق یقین۔ پختگیٔ عقیدت اور ایمان محکم کی معجز نمائیاں اور محبت۔ اور عمل پیہم کی فتوحات دیکھنے کے قابل ہونگی۔ شاعر کا عقیدہ ہے۔ اور وہ چاہتا ہے۔ کہ ہم بھی اس پر ایمان لے آویں۔ کہ ذوق یقین غلامی کی زنجیریں کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اور مرد مومن کی نگاہ تقدیریں بدل ڈالتی ہے۔

اقبال کی تعلیم مجذوب کی بڑ نہیں - انسان کی روحانی ترقی - اس کے عقیدے کے مطابق منشاء مقصد فطرت ہے - اور عین مشیّت ایزدی - اس مقصد کی تکمیل میں ایمان کی رہنمائی لابدی ہے - ایمان کی روشنی میں اخوّت کی جہانگیری محبت کی فراوانی کے جلوے نظر آئیں گے - رنگ و خون کی تفریق ناپید ہو جائیگی - اور پھر جہاد زندگانی میں فتوحات حاصل کرنے کے لیئے -

چہ باید مرد را - طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہ پاک بینے جان بیتابے

اگر یہ خوبیاں یہ صفات میسر ہوں - تو عنایات ایزدی کی کوئی انتہا نہیں - حالات حاضرہ شاہد ہیں - کہ ان اوصاف کے سامنے - مادیت کی سطوت - کو بھی سر خم کرنا پڑتا ہے - اور ان کے مقابلے میں تہذیب نو کی چیرہ دستی بھی نہتی ہو جاتی ہے - جنگ عالمگیر نے دنیا پر واضح کر دیا ہے - کہ رو در رو ہونے پر مادیت کی بلند پرواز صف آرائیاں عقابی شان و شوکت کے بازوؤں پر بھی ایمان کی طاقتوں کے سامنے بے بال و پر اور بے زور ثابت ہوتی ہیں - اور خداجو - خدا پرست - بے مقدور - اور مبہم ہستیاں - مادی ظلمات کی گھٹاؤں میں بھی آب و تاب سے نمودار ہوتی ہیں - تہذیب کے ماہران علوم و فنون اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان مہیا کرتے ہیں - اور دریا کے دل کو بھی چیر کر نکل جانے والے رودوں میں ہی پھنس کر فنا ہو جاتے ہیں لیکن اللہ کے بندے - اس کے احکام کے پرستار سمندر کی موجوں کے تلاطم سے بیش بہا گوہر بن کر نکل آتے ہیں -

غبار رہگذر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو

جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا

خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

کون سا دل ہے جو اسلام کا شیدائی ہو۔ اور ترکان احرار کے کارنامے سن کر خوشی سے پھولا نہ سمائے۔ کون سا دل ہے۔ چاہے کافر کے پہلو میں ہی ہو۔ جو یقین محکم اور جان بے تاب کے کرشموں کا قدر دان ہو۔ اور ترکی جان نثاری، اور پائندگی پر عش عش نہ کرے۔

زمیں سے نوریان آسماں پرواز کہتے تھے

یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے

اور اقبال یہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ سنتا ہے۔ اور ہم بے خبروں کو سناتا ہے۔ مزے لے لے کر سناتا ہے سمجھاتا ہے اور بجھاتا ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں

ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

کیا ہی شاندار کیفیت ہے۔ جو ہمارے قومی شاعر کے دل میں موجزن ہے سخنوری کے آبدار موتی ہیں۔ جو حکمت کی لڑی میں پرو کر دکھا دئے ہیں۔

یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے

یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

اور اسی اصول کے سلسلہ میں تعمیر ملت کے سرمایہ کے ضمن میں۔ خودی محبت۔ اخوت عامہ کی تلقین کی ہے۔ اور تہذیب حاضر کے ندبر پر نکتہ چینیاں ہیں۔ قیصریت اور شہریاری کی خون آشامیاں۔ تہذیب نو کی جھوٹی چمک۔ مغربی حکمت کی ہوس پرستی۔ سرمایہ داری کا کھوکھلا تمدن۔ سرتاپا عریاں کر کے

تہذیب نو کے فدائیوں کی ندامت کے لئے سامنے رکھ دئے ہیں۔

مسلمان کو عمل کی تلقین ہے۔ اور اسلام کی روایات اور شعائر پر چلنے کی تعلیم ہے۔ ان سے اجنبیت گمرہی ہے۔ اور گمرہی میں ذلّت ہے۔ کیا ہی خوب کہا ہے۔

حرم رسوا ہُوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

اس نظم کا آخری بند فارسی میں ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ بلا وجہ نہیں۔ اس وقت اقبال عالم اسلام کی نبض میں زندگی کے آثار پاتا ہے۔ اور اُس کی نگاہوں میں خواب کی گرانی جو اسلامیوں کو بے حس و حرکت کر رہی تھی زائل ہوتی نظر آتی ہے۔ اس نے احرارِ ملّت کی جادہ پیمائی کا تجمل بھی دیکھا ہے۔ اور اہل ایمان کے مرنے اور جینے کی حیرت فروش ساحری بھی ملاحظہ کی ہے۔ اس کا دل فرطِ طرب سے مخمور ہے۔ اور نشۂ مسرّت سے سرشار اور دل لبوں چھلک رہا ہے۔ جذبات کا دریا امنڈا ہُوا ہے۔ اور ولولے شور مچا رہے ہیں۔ اردو کی کج مج زبانی بیان سے قاصر ہے۔ جذبات کو راہ نہیں ملتا۔ ولولے پریشان ہیں۔ لیکن فارسی نے جذبات کی آبرو رکھ لی ہے۔ اور ولولوں کا احترام ترنم آفرینیوں کے انداز میں قائم رہنے دیا ہے حسن ادا اور شیریں زبان فارسی کا خاصہ ہے۔ اور ان جذبات اور ان ولولوں کے لئے فارسی کا دلاویز انداز ہی موزون ہو سکتا تھا۔ موزونیت خود بول رہی ہے۔ اور اس انداز پر دل و جان سے قربان ہے۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
بمشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیل از خونِ ما نمناک میگردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد
سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد
بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

تیسرے دور پر اجمالی نظر

تیسرا دور۔ ولایت سے واپسی کے بعد کا دور۔ اقبال کی اردو شاعری کا دورِ زرّیں ہے۔ اس دور میں پہلے دور کی وہ پریشانیاں نہیں۔ وہ ناکام جستجو نہیں۔ تصوّت کی وہ خیالی نکتہ آفرینیاں نہیں۔ اور حکمت کی وہ پھیکی بزم آرائیاں بھی نہیں۔

دوسرا دور قانونِ قدرت۔ اور آئینِ فطرت کے مشاہدات اور تجربات پر محدود ہے۔ اور اقبال کی آئندہ شاعری کا نظریہ قائم کرتا ہے۔ اور اس کے مقصد اور موضوع کا خاکہ تیار کر رہا ہے۔ پہلے دونوں دور ابتدائی مراحل ہیں۔

جو ضروری تھے۔ اور جن کی سعی اور جستجو نے تیسرے دور میں میدان سخنوری کے عالیشان ایوان کی تعمیر کی ہے۔

اس مرحلہ پر یہ نکتہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ پہلے دور کی پہلی نظم جو بانگ درا میں ہے۔ اس دور کی خصوصیات ظاہر کرتی ہے۔ اور یہی بات دوسرے اور تیسرے دور کی پہلی نظموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ پہلے دور میں ہمالہ کی چوٹی نوخیز تخیل شاعری کی جولان گاہ ہے۔ اور اس کے ذوق استفسار کی سادگی تسکی کی شاہد۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اس دور میں شاعر کو یہی ذوق آسمان و زمین پر لئے پھرتا ہے۔ اور جستجو کی تگ و دو میں پریشاں کر رہا ہے۔ دوسرا دور قانون قدرت کا تماشائی ہے۔ اور یہاں بھی شروع میں ہی محبت کے عنوان سے آفرینش عالم کے راز دکھائے جارہے ہیں۔ اور دور کی خصوصیت۔ قانون قدرت کے اسرار۔ اور ان کی تلقین بیان ہو رہی ہے تیسرے دور کی ابتدا بھی اس دور کی شاعری کا رُخ بتا رہی ہے۔ ملی جذبات کے ہنگامے ہیں۔ اور قوم کی شان جمالی کی جھلکیاں۔ اب تصوف اور حکمت بھی ملی خدمتگذاری پر مامور ہو گئے ہیں۔ اور ان کے عملی پہلو لئے ہوئے ہیں۔

یہ دور شروع سے اخیر تک تعمیری کام میں منہمک ہے۔ شاعر نے دورِ اوّل میں ذوقِ استفہام کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے بار بار تقاضوں پر دور دوم میں قدرت نے اپنے اسرار۔ زندگی کے راز اسے بتائے ہیں۔ اور اب قدرت کے اسرار۔ اس کے راز۔ اس کے آئین سے واقف ہو کر شاعر نے قوم کے لئے ملت کے قیام و دوام کی غرض سے لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جابجا قوم کے عیوب و نقائص مختلف رنگوں میں ظاہر کئے ہیں۔ اور مسلمان کو مسلمان بنانے

جمعیت اسلامی کا رابطہ استوار رکھنے پر زور دیا ہے۔ مسلمانوں کی کافر آئینی۔ اور روایات اسلامی سے گریز۔ حجازی شعار سے نفرت۔ اور تہذیب نو پر جاں نثاری کے ہولناک مناظر دکھائے ہیں۔ ایک طرف مسلمان کی زندگی کا کشتی ساز" نواہائے کلیسائی" سے بھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس کی حیات تازہ میں رقابت۔ خود فروشی۔ ناشکیبائی۔ اور ہوسناکی۔ کی لذتیں اس کی تلخ کامیوں کا سامان بنا رہی ہیں۔ مسلمان ہے کہ خدا اور خدا کی راہ فراموش کر بیٹھا ہے۔ اور بھولے سے نماز بھی جو کبھی ادا کرتا ہے وہ بھی برہمن کی خدمتگذاری ہیں۔ اور سر نیاز جو کسی وقت جھکاتا ہے۔ وہ بھی اغیار کی منت پذیری ہیں۔ اور اُدھر۔ خدا کی شان ہے۔ کافر ہے کہ مسلم آئینی سے حور و قصور کا حق دار بن بیٹھا ہے۔

ان وحشت خیز نظاروں میں مسلمانوں کو خدائی وعدہ یاد کرایا ہے۔ ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور آفرینش کے وسیع میدان میں مسلمان کی حیثیت۔ اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

اور اس حیثیت کو اس کے ذہن نشین کر کے پھر زندگی کی حقیقت بتائی ہے اور اس حقیقت کی روشنی میں اسے اپنی زندگی کا ایک شاندار دستور العمل بنانے کی تعلیم ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ فرد بذاتہ ہیچ ہے۔ لاشئے ہے۔

اس کی آبرو جمعیّت ملّت میں ہی ہے۔ اگر یہ جمعیّت سے الگ ہُوا تو سوائے رسوائی کے اسے کچھ حاصل نہیں۔ اس کی کوئی عزّت نہیں۔ کوئی آبرو نہیں۔

فرد قائم ربط ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اسی طرح جابجا انفرادی زندگی کے اصول۔ اور جمعیّت کی ضرورت کی تلقین ہے۔ اور مختلف پیرایوں میں نئی نئی مثالوں سے۔ ان اصول۔ اور اس ضرورت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں خودی۔ خودداری۔ اور خود افزائی کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ اور ان مسائل پر عمل کرنے کی ہدایات ہیں۔

ہر ایک مرحلہ پر عمل کی تلقین بھی ہے۔ اور ہماری آگہی کے لئے یہ راز عیاں کیا ہے۔ کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال کا ایمان ہے کہ مسلمان سے دنیا کی امامت کا کام لیا جانا ہے۔ اور اپنے اس عقیدہ کی پختگی میں وہ مسلمان کو مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ اور امامت کا اہل۔ اس غرض سے اس دور کی شاعری سر تا پا تعلیم و تلقین سے بھری پڑی ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ۔ اس کا تصوّف۔ اس کا فلسفہ اسی مدعا۔ اسی مقصد کے حاصل کرنے میں ساعی ہے۔ اس مدعا کے حصول میں اقبال نے فن شاعری کا کمال دکھایا ہے۔ اور تصور۔ تخیل۔ انداز اور بیان کی نزاکت۔ اور لطافت کی سحر آفرینیوں سے دلوں کو مسخر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ جدت ادا اور ندرت خیال بندی کے

وہ نقشے جاتے ہیں۔ کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اس مدعا کی تکمیل میں اقبال نے مسلم کے سامنے ایسے دلپذیر اور دلربا مناظر پیش کر دئے ہیں۔ جو اس کے دل میں نئے جوش۔ نئی امنگیں۔ اور نئے ولولے پیدا کر رہے ہیں۔ اور وہ سلف کی دلسوزی۔ جان فروشی عقیدت اور صداقت سے زندگی کے مراحل طے کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے۔ اقبال کی وہ بلند خیالی زندگی کے ادق اور سنجیدہ مسائل شوکت بیان میں ادا کرتی ہے۔ اور اس کی معنے آفرینی حالات حاضرہ کی پیچ در پیچ راہوں میں انکشاف حقیقت سے حیرت کے نظارے دکھاتی ہے۔

اس کی روشن ضمیری ماضی و حال کے آئینہ میں استقبال کی تصویر نادر خیالی کی رنگ آمیزیوں سے دل لبھانے والے پیرایہ میں کھینچتی ہے۔ اور دیکھنے والوں کو مسحور کر کے منزل مقصود کی طرف لے جا رہی ہے۔

جیسا کہ شیخ عبدالقادر صاحب "بانگ درا" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔ "جو نظمیں دور سوم میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں۔ اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اشہب قلم جو فارسی کے میدان میں گامزن ہے۔ اس کی باگ کسی قدر تکلف کے ساتھ اردو کی طرف موڑی جا رہی ہے"

یہ سب کچھ صحیح لیکن اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اقبال کے اردو کلام کا بہترین حصہ اسی دور کا لکھا ہوا ہے۔ اس دور میں شاعر حقیقت کا ترجمان ہے۔ اور قدرت کا راز دار۔ مظاہرات قدرت اس کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ وہ ان سے اسرار زندگی سیکھتا ہے۔ اور بسا اوقات انہیں اصول حیات کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اور کمال زندگی حاصل کرنے کے

گر بھی بنا تا ہے۔

تیسرا دور لمبی نظموں اور بہترین نظموں پر ناز کرتا ہے۔ ان میں سے شکوہ۔ شمع و شاعر۔ خضر راہ۔ اور طلوع اسلام۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاسوں کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اور ان میں ہی پڑھی گئیں۔ انجمن چند غریب مسلمانان پنجاب کی عرق ریزی اور محنت کا پھل ہے۔ اس کا کالج۔ کئی مدرسے بچوں اور بچیوں کے۔ اس کا یتیم خانہ مردانہ اور زنانہ۔ اور اس کا کتب خانہ بنانے میں بانیان انجمن کے سوا جن اصحاب نے سخنے۔ قلمے۔ قدمے۔ درمے سعی کی ہے ان میں اقبال کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مولانا نذیر احمد اور اقبال ان بزرگان قوم میں سے ہیں۔ جن کی سخنوری کی سحر آفرینی اور جن کے قلم کی جادو نگاری مسلمانوں بلکہ دوسری اقوام کو بھی انجمن کے اجلاس میں جوق جوق کشاں کشاں لے آتی تھی۔ اور ان کے ایک ایک فقرہ پر۔ ایک ایک شعر پر تحسین و آفرین کے نعروں میں سینکڑوں۔ ہزاروں روپے انجمن کے خزانوں میں بن مانگے چلے آتے تھے۔ مولانا نذیر احمد خدا انہیں غریق رحمت کرے پہلے بزرگ ہیں جن کی زبان نے جن کے کلام نے عامۂ خلائق کو انجمن کے جلاسوں میں شامل ہونے اور دلچسپی لینے کا شوق دلایا۔ اور انجمن کی رونق روز بروز بڑھائی۔ انجمن کے اجلاسوں میں خلقت کا وہ ہجوم نظر آنے لگا۔ جو کسی اور مجلس کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کی حیات میں ان کے ساتھ ساتھ اور ان کی وفات پر تن تنہا اقبال کی ترنم ریزیوں نے۔ ہندو مسلمانوں کو۔ بوڑھوں اور جوانوں کو۔ اور بالخصوص کالجوں کے طلبا کو اس مقناطیسی کشش سے کھینچا۔ کہ بعض اوقات انجمن والوں کو اپنے اجلاس کی احاطہ بندی۔ جو میدان میں قناتوں اور شامیانوں سے کی ہوتی تھی توڑنی پڑتی تھی۔ اور سننے والوں کا اژدہام اس قدر ہو جاتا تھا۔

کہ کارکنانِ انجمن اس کا انتظام مشکل سے کر سکتے تھے۔ لیکن جب اقبال کھڑے ہوتے سناٹا سا ہو جاتا۔ اقبال پڑھتے تھے اور سننے والے مسحور ہو جاتے تھے روپوں کا مینہ برستا تھا۔ چندہ دینے میں ہر ایک دوسرے پر سابقت کرتا تھا یہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے یا کارکنانِ انجمن کو وصولی چندہ کے قلمبند کرنے کے لئے مہلت دینے کی غرض سے۔ چند منٹوں کے لئے خاموش ہو جاتے تھے۔ لوگ بے تاب ہو جاتے۔ یہ پھر پڑھنا شروع کرتے۔ اور سامعین کے جیب خالی کرا لیتے۔

طلوعِ اسلام آخری نظم ہے۔ جو اقبال نے شروع ۱۹۲۳ء میں انجمن میں پڑھی۔ افسوس ہے کہ اب وہ انجمن کے اجلاسوں میں شامل نہیں ہوتے۔

بہر حال انجمن کے کاموں میں اقبال کی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناشکر گذاری ہوگی۔ کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ قوم کا یہ خیر جاری۔ انجمن کی شاندار عمارتیں۔ اس کا عظیم بالشان کام۔ اس کا اقتدار۔ جو ایک بڑی حد تک مولانا نذیر احمد اور علامہ اقبال جیسے بزرگانِ قوم کی دلسوزی۔ قابلیت اور مقبولیت عامہ کی کمائی کا نتیجہ ہیں۔ اب چاہے کسی کے ہاتھ میں آئیں کوئی ان پر قابو پالے۔ اور کسی کے زیرِ اہتمام رہیں۔ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے نذیر احمد اور اقبال کی یادگاریں ہونگی جنہیں مسلمانوں کی شکر گذار قوم کبھی نہیں بھول سکتی۔

اس دور میں وطنیت کی زور سے مخالفت ہے۔ اور اتحادِ ملی پر اصرار۔ وطنیت اصولِ اسلامی کی منافی۔ اور جمعیتِ ملت کے قیام و دوام کے لئے لازمی قرار دی گئی ہے۔

اس دور کی شاعری کی خصوصیات اقبال نے خود ایک مضمون بیان

کردی ہیں۔ وہ آپ کے پڑھنے کے قابل ہے۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبّت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبّت ہو، بیباک صداقت ہو
سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے
میں بلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

دعا بنا رہی ہے۔ کہ اقبال مسلم سے اور مسلم کے لئے کیا چاہتے ہیں۔ اور اسی مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی جادو بیانیوں سے مسلم کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔

اس دور میں زبان کے محاسن اور بیان کی خوبیاں بے عدیل ہیں۔ اور حسن ظاہری کے ساتھ ساتھ ہی حسن معنوی بھی اس قدر روح افزا اور نشاط انگیز ہے کہ انسان کو فرط طرب میں جھومنے کے سوا چارہ نہیں۔

اس ضمن میں صرف ایک دو مثالیں آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ اس سے اقبال کی شاعری کے متعدد مراحل میں مختلف مدارج کا پتہ مل جائیگا۔ اور اُمید ہے۔ کہ اہل مذاق اصحاب حظ وافر اُٹھائیں گے۔

آپ دیکھیں گے۔ کہ پہلے دور میں ہمالہ کی وادیوں میں۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوتی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

قدرت کا منظر۔ اور اس کی دلفریب تصویر۔ سرور کے سامنے سے شاعر کو سرشار کر رہے ہیں۔ انداز دلکش ہے۔ اور حسن ادا ہوش ربا۔

مگر یہی چیز یہی ندی تیسرے دور میں بھی شاعر کے سامنے آتی ہے لیکن اب اس کی آمد۔ اس کی افتاد۔ اس کی پریشانی۔ اور پھر اس کی جمعیت حکمت کے موتیوں سے لبریز ہے۔ یہاں حسن ظاہر کی دلچسپیاں نہیں۔ موسیقیت کے ساحرانہ ترنم کی شنوائی نہیں۔ دل جو پہلے آواز پر لگا ہوا تھا۔

اب حقیقت کو بے نقاب دیکھ کر محو حیرت ہو رہا ہے۔ اور آنکھیں اور کان جو پہلے حسن نظارہ۔ اور خوبی ترنم پرست ہو رہے تھے۔ اب ہستی انسان کے روح پرور کرشموں سے طرب اندوز ہو رہے ہیں۔ اور سبق آموز بھی ہیں۔

آتی ہے ندّی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجران قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی
پستئ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

دوسری مثال اور بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ دور دوم میں انسان فلسفہ کی بھول بھلیاں میں حیران و سرگرداں ہو رہا ہے۔ اور ہمارا فلسفی شاعر بھی اس کی ہمدردی میں بے تاب و پریشان۔ شاعر رنج و اندوہ سے دیکھتا ہے کہ۔

لذّت گیر وجود ہر شے -
سرمست می نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسار انسان
کیا تلخ ہے روزگار انسان

لیکن تیسرے دور میں شاعر کا دماغ۔ اس کا تخیل یکس پیری کی تلخیوں سے کہیں بالاتر ہے۔ پہلے وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ انسان کے سوا دنیا کی ہر چیز "لذّت گیرِ وجود" ہو رہی ہے۔ اور مے نمود سے سرمست نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتا تھا۔ کہ انسان کا کوئی بھی غمگسار نہیں۔ اور اس کی زندگی تلخ ہے۔ اب قدرت کے رازدار دل نے اسے بتایا ہے۔ کہ موجودات عالم کا حضرت انسان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ان کی لذت گیری اور ان کی سرمستی اس کی فطرت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ دنیا کی ہر ایک چیز باوجود اپنی سرمستیوں کے تسلیم کی خوگر ہے۔ اور قدم قدم پر مجبور ہے۔ مگر انسان ہے۔ کہ اس کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے۔ اس کی ہستی۔ ہر لحظہ۔ بڑھنے۔ پھلنے اور پھولنے میں ساعی ہے۔

اس ذرّہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرّہ نہیں شاید سمٹا ہُوا صحرا ہے

صاف ظاہر ہے۔ کہ انسان کو کسی غمگسار کی ضرورت نہیں۔ اس کے تلخ روزگار ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر وہ سمجھے تو دنیا والوں کی غمگساری سے وہ بے نیاز ہے۔ اس کی اپنی ذات کے اندر وہ طاقتیں ہیں جو اپنی دنیا آپ بنا لینے پر قادر ہیں۔ چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے' بینا ہے' توانا ہے

اہل بینش کے لئے انسانی زندگی کے یہ دونوں نقشے اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی ادا میں کیا ہی دلفریب ہیں۔ اور اقبال کے فلسفہ کی سحر کاری کے کیا ہی حوصلہ شکن اور دل افروز نظارے ہیں۔ دوسرے دور میں شاعر حیات انسانی میں افسردگی دیکھتا ہے۔ اور افسردہ دل ہو کر انجمن کو افسردہ کر رہا ہے دور سوم میں زندگی کے آثار حرکت اور ارتقا میں موجزن ہیں۔ اور شاعر کا دل بھی اس تموج میں اچھلتا ہے۔ اور انسانی زندگی کے ممکنات کے تخیل میں سرور و انبساط کا حظ اٹھا رہا ہے۔

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

مضامین کلام

مضامین کلام

آزاد اور اردو انشا پردازی

"اردو میں جو سرمایہ انشا پردازی کا ہے۔ فارسی کی بدولت ہے۔ قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لطف اٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے۔ ذی استعداد قصیدے بھی کہنے لگے۔ اردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا۔ لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے۔ کہ سنتے سنتے کان تھک گئے ہیں۔ وہی مقرری باتیں ہیں کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں۔ کہیں اَدَل بدل کرتے ہیں۔ اور لئے جاتے ہیں۔ گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں۔ انہیں کو چباتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزا رہا۔ حسن و عشق! سبحان اللہ! بہت خوب لیکن ایک حور ہو یا پری گلے کا ہار ہو تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے۔ اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی۔

ایک دشواری یہ بھی ہے۔ کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ۔ الفاظ و معانی۔ استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں۔ اور وہ اس قدر زبان پر رواں ہو گئے ہیں۔ کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے۔ اگر اور خیال نظم کرنا چاہے۔ تو ویسا سامان نہیں پاتا۔ البتہ ذی استعداد مشاق چاہیں تو کر بھی سکتے ہیں۔ لیکن کمبخت حسن و عشق کے

مضمون۔ اس کے خط و خال۔ اور بہارِ گلزار کے الفاظ ان کی زبان و دہان میں پہنچے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں۔ تو اوّل اُسے بھلائیں۔ پھر اس کے مناسب مقام ویسے ہی نرالے استعارے۔ نئی تشبیہیں۔ انوکھی ترکیبیں۔ اور لفظوں کی عمدہ تراشیں۔ پیدا کریں۔ اور یہ بڑی عرق ریزی اور جان کاہی کا کام ہے۔ بے ہمتی جو ہماری قوم پر حاکم با اختیار بنی ہوئی ہے۔ اسے اس سے زیادہ روکنے کا موقع کیا مل سکتا ہے۔

اس اتفاق معاملہ نے اور تو جو کیا سو کیا۔ بڑی قباحت یہ پیدا کی۔ کہ ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا۔ کہ اردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں۔ اور یہ ایک بڑا داغ ہے۔ جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں۔ کہ اسے کون دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے۔ جو کشور علم میں مغربی اور مشرقی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ اُن کی ہمت آبیاری کریگی۔ دونوں کناروں سے پانی لائیگی۔ اور اس داغ کو نہ فقط دھوئیگی۔ بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دیگی!"

لاہور میں ایک نئی قسم کا مشاعرہ

یہ ہیں اردو شاعری پر آزاد مرحوم کے خیالات۔ اور اس کے مستقبل کی نسبت ان کی اُمیدیں اور خواہشات۔ انہی خیالات اور خواہشات کی بنا پر۔ مرحوم نے لاہور میں۔ مولانا حالی کے الفاظ میں۔ "اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جو ہندوستان میں اپنی نوعیّت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا۔ اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں۔ نظم میں ظاہر کریں۔" حالی جو اُن

دلوں لاہور میں ہی گئے۔ ان مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ اور ان کی چار مثنویاں۔ ایک برسات پر۔ دوسری اُمید پر۔ تیسری رحم و انصاف پر۔ اور چوتھی حب وطن پر۔ انہی مشاعروں کی مرہون ہیں۔

اقتباس بالا سے جو ہم نے آبحیات سے کیا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ آزاد اردو شاعری کے نفس مضمون حسن و عشق کی کہانی۔ اور ہوس پرستی پر معترض تھے۔ اور ساتھ ہی اس کے زبان میں جو حسن و عشق کی بدولت رنگین بیانیاں آ گئی تھیں۔ ان کے چٹخارے کی دقت آفرینیوں سے بھی گھبراتے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ حسن و عشق کے راز و نیاز کی باتیں۔ اپنے دلفریب طرز بیان سے کہنے والے کی زبان پر۔ اور سننے والوں کے کانوں میں ایک شیفتگی پیدا کر چکی ہیں۔ جو کسی دوسرے مضمون کے سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرنے سے میسر نہ ہو گی۔ اور سادگی بیان سے کلام کی خوبی اور لطافت میں فرق آ جائیگا۔ جو اس کی دلپذیری میں کوئی وجہ نہیں کہ ہالج نہ ہو۔ آزاد کے دل و دماغ نے اس مشکل کا حل مشرق و مغرب کے ملاپ میں دیکھا۔ اور اُمید ظاہر کی۔ کہ مغرب کی مضمون آفرینی مشرق کی رنگیں ادائیں۔ اور اپنی جلوہ آرائیاں دکھا کر۔ اردو شاعری کی پاکیزگی۔ اور رونق کا باعث ہو گی۔ یہ اُمید کہاں تک۔ اور کس طرح پوری ہوئی آئندہ اوراق میں ظاہر ہو گا۔

حالی — حالی لاہور سے دلی چلے گئے۔ مگر آزاد کی تحریک سے آزاد نہ ہوئے اور سرسید کی جادو اثر نظر کی پاٹھردی سے حالی نے مسدس لکھی۔ اور اردو شاعری کے پشت جیجوں پر اس میں ایک شاندار مینار ترقی قائم کر دیا۔ جو شاعرانہ مذاق کی جولانیوں کے لئے قومی زندگی کے پر فضا میدان کی

رہا ہیں دکھا رہا ہے۔ حالی حسن و عشق کی داستانیں سن سن کر تنگ آ گئے تھے۔ اور ان کے استعاروں اور تشبیہوں سے بھی بیزار تھے۔ انہوں نے آزاد کے انتباہ کی کچھ پرواہ نہ کی۔ مضمون کی تبدیلی میں طرزِ بیان بھی بدل دیا۔ قوم کی کہانی سیدھے سادھے الفاظ میں کہی گئی۔ بظاہر پھیکا رنگ بے رونقی کی صورت دکھاتا تھا۔ مگر شاعر کا دردِ دل مقبولیتِ عامہ کا کفیل نظر آیا۔ اور مسدس افصاحتے ہند میں بچہ بچہ کے زبان پر جاری ہو گئی۔

آزاد کی تحریک اور حالی کی ہمت نے اس طرح اردو شاعری میں ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی۔ اور اس دورِ جدید میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ زبان اردو۔ ہوس پرستی کی مبتذل خدمت گذاریوں سے سبکدوش ہو رہی ہے۔ اور قوم کو بیدار کرنے کی مقدس خدمت پر مامور ہو چلی ہے۔

حالی کو بلبلِ ہند کہتے ہیں۔ اور شاعرِ پاکستان کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ہمارے ادبیات میں بلبل۔ اپنے نالوں۔ شور و شیون۔ اور زاری و فغاں کے لئے معروف ہے۔ اور اگرچہ حالی نے

بلبل کی چمن میں ہمزبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

مگر مسدس میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت پر نوحہ خوانیاں کر کے اپنے نالوں سے بلبلِ ہند کا نام پایا ہے۔ اور شاعرِ پاکستان کا لقب لیا ہے۔

اکبر حالی کے بعد اکبر نے انہی اصول پر اپنے خاص مذاقیہ پیرایہ میں سخنوری کی داد دی۔ اور قومی مضامین پر طبع آزمائیاں کیں۔ اکبر زمانہ حال کے واقعات و حالات پر ظرافت کے لہجہ میں نکتہ چینیاں کرکے۔ جا بجا قوم کو راہ راست پر۔ اسلام کے جادۂ مستقیم پر۔ چلنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ حالی

کی طرح یہاں بھی صاف گوئی اور سادگی ہے۔ جو اکبری رنگ میں لطف دیجاتی ہے۔ اکبر فی الحقیقت حالی شاعر ہیں۔ اور لسان العصر کے موزون نام سے مشہور ہیں۔

لیکن ہم نے دیکھا ہے۔ کہ آزاد کی آرزو تھی۔ کہ مشرق و مغرب ملیں۔ اور ان کے ملاپ میں اردو شاعری کے جوہر نمایاں ہو کر اردو کو دنیا کے ادبیات میں عزت و وقار کی مسند پر جلوہ آرا کر دیں۔

اقبال نے علوم مشرقی و مغربی میں دسترس پیدا کی۔ ایشیا اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے تبحر علمی کی سندیں لیں۔ اللہ نے طبیعت اور مذاق شاعرانہ عنایت کئے تھے۔ فلسفی اور صوفیانہ تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ زمین شعر میں مشرق و مغرب کے سنگم سے وہ آبیاریاں کیں۔ کہ چپہ چپہ پر گل و گلزار کے تختے نظر آنے لگے۔ اور موتیوں کے دریا امڈ آئے

زشعر دلکش اقبال می تواں دریافت

کہ درس فلسفہ نے داد و عاشقی ورزید

اقبال نے ہوس پرستی کی مضمون نگاری سے آزاد ہو کر رفعت مقاصد اور عالی ہمتی کی فضاؤں میں بلند پروازیاں کیں۔ اور قومی۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ فلسفی۔ صوفیانہ اور سیاسی مضامین پر اپنی سحر طرازیوں سے بے بہا موتی پرو کر اردو کے خزانے بھر دیئے۔

نور توحید کی جوت

اقبال بھی حالی اور اکبر کی طرح قومی شاعری کا علم بردار ہے۔ پرانی شاعری کا بتخانہ۔ ہند میں سو سال سے مرجع خاص و عام ہو رہا تھا۔ اور اس صنم خانے کے بت اپنی رنگین اداؤں۔ اور بوقلموں جلوہ پیرائیوں سے لوگوں کے دلوں میں گھر بنائے ہوئے تھے۔ حالی اور اکبر نے ان بتوں

کے طلسم مسمار کرنے میں سعی کی جس کی اردو زبان ہمیشہ کے لئے ممنون رہیگی۔ اس بت شکنی کے جہاد میں حالی اور اکبر کے دوش بدوش اقبال بھی شریک کار رہے۔ لیکن اس کی شرکت کار میں شخصی عنصر نمایاں ہے۔ پرانی قسم کے بتوں سے قطع تعلق کرنے۔ اور ان کے انہدام میں کبھی اقبال نے بت پرستی سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ اور اس نے اپنی اور اپنے ہم نواؤں کی نغمہ سرائیوں کے لئے قومیت کے مندر میں نئی قسم کا ایک لطیف بت لا رکھ دیا ہے۔ اور یہ مندر انسان کے دل میں بنایا گیا ہے۔

اقبال کے اس صنم خانہ میں پرانے بتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں صرف نور توحید کی جوت جلوہ گر ہے۔ ہوس بازی معتوب۔ اور حقیقت مطلوب ہے نور توحید کے اس بت کے پجاریوں کے لئے مشرق سے ہوں یا مغرب سے کالے ہوں یا گورے۔ ایرانی ہوں خواہ تورانی۔ یونانی خواہ المانی۔ عرب ہوں چاہے ترک۔ ہندی ہوں چاہے جاپانی۔ مندر کے دروازے شب و روز کھلے ہیں۔ اور اس کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی نور الٰہی کی رسی کی لطیف باریک تاریں۔ ان پجاریوں کے گلے میں۔ نہیں نہیں۔ دلوں میں بلا لحاظ رنگ و نسل۔ رشتہ اخوت قائم کر دیتی ہیں۔ جو اس معبد کی قدیم روایات کے رو سے کل دنیاوی تعلقات سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

یہ ہے اقبال کا معیار قومیت اور اس کی شاعری کا مقصد۔ اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے۔ اس صنم خانہ کو مرجع کافۃ الناس بنانے اور ساری دنیا کو توحید کا والہ و شیدا کر دینے کی غرض سے۔ اقبال کے تخیل نے سحر کاریاں کی ہیں۔ اور جس قوم کو جو امانت توحید کی کفیل اور دعویدار ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت بھی دے چکی ہے۔ اور مسلم کے نام سے معروف

ہے۔ اس کی بھاری ذمہ داری کا احساس۔ کرانے کی نیت سے اپنی نظموں میں بالخصوص مخاطب کیا ہے۔ اور غفلت شعار۔ خدا فراموش مسلم کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلا کر کھلے لفظوں میں بتایا گیا ہے۔ کہ

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقت فرصت ہے کہاں! کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اقبال پہنائے عالم میں توحید کے نعرے سننا چاہتا ہے۔ اور ساری خدائی کو خدائے واحد کا پرستار دیکھنے کا خواہاں ہے۔ وہ مذہب کی پاکیزگی میں، اور اس کے نزدیک مذہب میں وحدانیت خدا کے بغیر پاکیزگی ممکن نہیں۔ انسان کی زندگی کے مدارج اعلیٰ پاتا ہے۔ اور یقین کرتا ہے۔ کہ انسانی ترقی۔ اس کی حقیقی ترقی کا معراج یہی ہے۔ یہی پاکیزگی ہے۔ مادی ساز و سامان چاہے کتنی ہی حیرت اور استعجاب کی تماشائیں کرے۔ سطوت و شوکت کے مظاہرے دکھائے۔ اس سے حقیقی ترقی میسّر نہیں۔ بلکہ اس میں نسل انسان کی تباہی اور ویرانی مضمر ہے۔ انسان زمین پر اللہ کے نائب کی حیثیت میں ہے۔ اور اس کے فرضِ منصبی کی ادائگی میں مادیت کی جھنکار۔ گرج اور گونج کا کوئی حصّہ نہیں۔ کچھ واسطہ نہیں۔ یہاں دل کی تطہیر۔ اور روح کی پاکیزگی درکار ہے اور بس۔ اقبال یہ حقیقت مسلم پر نئے نئے طریقوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس سے امید کرتے ہیں۔ کہ وہ اس حقیقت کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ

کی صلاحیت اپنی زندگی میں پیدا کریگا۔ اور اپنے آپ کو اس بار امانت کے سنبھالنے کے لائق ثابت کردیگا۔

دل نواز مستقبل

(۲) ادبیات اردو میں قومی شاعری سے شعبہ نظم کا دور جدید شروع ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ اس دور کے داغ بیل لگانے میں قوم حالی اور اکبر کی مساعی جمیلہ کی مرہون ہے۔

مولانا حالی نے قوم کی تباہی۔ ذلت اور رسوائی کے نظارے دیکھے۔ دل بھر آیا۔ قوم کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے۔ اور غفلت کی نیند سونے والوں کو بیدار کرنے کے لئے۔ مسدس کی بنیاد ڈالی۔ اردو شاعری کی شاہراہ میں مسدس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ ایک شاندار مینار ہے۔ جو اس رستہ میں چلنے والوں کو ایک پرفضا میدان دکھا رہا ہے۔ جہاں دل بستگی۔ اور شگفتگی طبیعت کے سامان۔ اگر راہرو توجہ کرے۔ بکثرت موجود ہیں۔

مولانا حالی نے قوم کو بیدار کرنے کی غرض سے۔ اسلاف اسلام کی ترقی۔ اور پھر زمانہ حال کے مسلمانوں کے تنزل کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور صاحب سحر منصور نے جگہ جگہ پر ایسے رنگ بھر دئے ہیں۔ کہ مقابلہ سے آنکھ خیرہ ہوجاتی ہے۔ اور دل پر ایک حالت طاری ہوتی ہے۔ جو استاد فن کا عین مقصد ہے۔ ناکارہ غفلت شعار مسلمان کو ایک دل گداز اور ساتھ ہی دل افروز انداز میں بتایا گیا ہے۔ کہ اس کے بزرگ کون تھے۔ کیا تھے۔ انہوں نے دنیا میں کیا کچھ کیا۔ کیا کچھ نہ کیا۔ ایک عالم ان کے علم و ہنر کا ممنون دنیا ان کی تہذیب کی مرہون ہے۔ ان کی شان و شوکت۔ ان کی دولت و ثروت۔ ان کی سطوت و جبروت۔ ان کی عدالت۔ ان کی شجاعت۔ تاریخ کے سنہری صفحات پر چمک رہی ہیں۔ اور ابدالآباد تک درخشاں رہینگی۔

ایک طرف تو یہ دل افروز اور روح پرور مرقع ہے۔ اور دوسری طرف اسی مسلمان ناکارہ، غفلت شعار مسلمان کی آنکھوں کے سامنے۔ اسے غیرت دلانے کے لئے۔ اس کی رگِ حمیّت کو جوش میں لانے کی غرض سے۔ اس کی اپنی موجودہ حالت کا خاکا اُتارا ہے۔ اس خاکے میں کہیں تو اس کے افلاس۔ اس کی بد مذاقی۔ اور بد اطواریوں کے دل شکن مناظر ہیں۔ اور کہیں اس کی نکبت حرماں نصیبی۔ اور شقاوت کی جگر پاش تصویریں ہیں۔ مولانا کا مدعا او مقصد تھا کہ مسلمان یہ سب کچھ دیکھے۔ سمجھے۔ شرم اور غیرت سے کام لے۔ اور اپنی بگڑی حالت کو کسی طرح سنوارے۔

حالی نے قوم کی ذلت اور اس کے ادبار کی گہرائیوں میں یاس و حرمان کی تاریکیاں دیکھی ہیں۔ اور اس ظلمت کدے کے ڈراونے اور تباہ کن اثرات سے قوم کو بچانا چاہتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ

یہ جو کچھ ہُوا ایک شمہ ہے اُس کا
کہ جو وقت یاروں پہ ہے آنے والا
زمانے نے اونچے سے جس کو گرایا
وہ آخر میں مٹی میں مل کر رہیگا
نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

حالی کا رونا کام آگیا۔ اور اس کی آہوں کا جادو چل گیا۔ نیند کے متوالے مسلمان متوحش خواب دیکھنے لگے۔ گھبرا اُٹھے۔ اور ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ مگر ذرا جاگے تو تہذیب نو کی جگمگاہٹ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اور اسی فلسفگی میں اُفتاں و خیزاں اس کے پیچھے ہو لئے۔

اکبر اسلام کے پورے عقیدت مند۔ اور پرانی وضع کے پابند مسلمانوں کی اس مستانہ روش سے اتنے ہی بیزار ہوئے۔ جتنے حالی ان کی خود فراموشی سے نالاں تھے۔ اکبر دیکھتے تھے۔ کہ یہ لوگ قعرِ ذلت سے نکل کر چاہِ ضلالت میں جا رہے ہیں۔

عقائد میں ضعف اور تبدیلیاں۔ شعار ملت سے بے اعتنائی، شخصی شرافت ناپید۔ قومی جمعیت نابود۔ نئی زینتیں۔ نئی خواہیں۔ نئی خوشیاں۔ نئے غم۔ بے پردگی، شہوہ۔ بے حیائی وغیرہ۔ کھوٹی زبان۔ اور غیر معتبر تحریر۔ اکبر کے اسلام کیش تخیل میں کھٹکتے تھے۔ اور اس کے دل کو ٹھیس لگاتے تھے

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے
وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگِ وفا نہ رہا کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے
نہ وہ آن رہی۔ نہ امنگ رہی نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رخ نہ رہے در دیر پہ نقش جبیں نہ رہے
نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے نہ فدائی عہدِ الست رہے
وہ طریقہ کارِ جہاں نہ رہا وہ مشاغل رونقِ دیں نہ رہے

اکبر کے سامنے ایسے ہی جگر پاش منظر تھے۔ اور وہی دردِ دل۔ وہی دردِ دل جو حالی کو بے تاب کر رہا تھا۔ انہیں بھی ستاتا تھا۔ زمانۂ حاضرہ کی سستیٔ ایمان۔ اور شعار ملی سے بیزاری بالخصوص۔ اکبر دیکھتے تھے۔ اور قوم کی ناہنجاریوں۔ اور بے اعتنائیوں سے نالاں تھے۔ دل کی جلن اور زبان کی تیزی نے اپنے جوہر دکھائے۔ اللہ جل شانہ نے ان کی زبان میں ایک

طاقت پیدا کی تھی۔ جو کبھی کسی کو میسّر نہیں۔ جو کسی کو میسّر ہونی مشکل ہے۔ ظرافت کا لہجہ۔ جو سننے والے کے دل میں چٹکیاں لے۔ جو سننے والے کو بے حال کر دے ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ اسی لہجہ میں بات بات پر۔ قوم کو۔ ملک کو۔ مغربی تہذیب۔ اور اس کی جگمگاہٹ کے تباہ کن اثرات سے متنبہ کرتے رہے۔ مسلمانوں کی کافرآئینی پر پھبتیاں کہیں۔ ان کی مسلمانہ روشوں کی ہنسی اڑائی۔ اور ان کے دورِ حاضر کی سحر کاریوں پر مفتون ہونے کی وہ گت بنائی کہ زمانہ عش عش کر رہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے۔

شیخ کی بات بگڑنے سے بھی مطلق نہ بنی
بادہ خواری میں بھی اس شوخ سے گاڑھی نہ چھنی

اکبر کا طریق کار حالی سے جداگانہ تھا۔ یہاں حالی کے نالے نہیں۔ مذاق ہے ہنسی ہے۔ لیکن مذاق اور ہنسی جو زندگی کے اہم ترین اور متین مسائل کے حل کرنے میں ساعی ہیں۔ مذاق اور ہنسی جو ہنساتے ہیں۔ گر ہنسی ہنسی میں دل پر چوٹ لگا جاتے ہیں۔ جو کبھی بھول نہیں سکتی۔ اکبر کی شاعری کی بڑی خصوصیت ظرافت ہے۔ اور ہم نے دیکھا ہے۔ کہ وہ کسی امر پر طعن یا ملامت کرتے ہیں۔ اکثر بذلہ سنجی۔ ظرافت۔ اور تمسخر سے کام لیتے ہیں۔ اور اس میں کلام نہیں ہو سکتا۔ کہ انہیں اس فن میں وہ کمال حاصل ہے۔ کہ سننے والے تو کہیں رہے۔ ان کے تیر ملامت کا ہدف بھی ایک دفعہ تو اس پر قربان ہو جاتا ہے۔ اور داد دینے سے نہیں رک سکتا۔ ان کی ظرافت میں چوٹ کے ساتھ ہی ایسا چٹخارا بھی ہوتا ہے۔ کہ مذاق کا لطف ٹکور کے صدمہ کو زبان کے مزے میں فراموش کر دیتا ہے۔ اور ملامت کی رسوائی کو بذلہ سنجی کے رنگ میں بدنمائی کی ذلت سے محفوظ کر لیتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

ترقّی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

اس کے قہقہوں میں غم و غصّہ کی گلوگیری۔ اور اس کے مذاق میں رنج کی خلش اور طعن کی خراش ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

اکبر بھی حالی کی طرح قوم کی حالت زار پر غمناک ہیں لیکن روتے نہیں ہنستے ہیں۔ اور ہنس کر، ہنسا کر قوم کو گمراہی کے گڑھوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ اور راہ راست۔ اسلام کی راہ پر لانے کے متمنی ہیں۔

حالی نے اپنے سوز و گداز سے مسلمان تو کیا نامسلمانوں کے دل بھی ہلا دئے اور اکبر نے اپنی شیوا بیانیوں سے نئی روشنی کے شیدائیوں کی آنکھیں کھول دیں مگر نیند کے متوالے، جاگتے جاگتے لیٹ جاتے تھے۔ اور تہذیب نو کے جاں نثار دیکھتے دیکھتے دل باختہ ہو رہے تھے۔

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

ان نیند کے ماتوں اور تہذیب کے دلدادوں کو ہوش میں لانا سہل نہ تھا مگر اس میں شک نہیں۔ کہ حالی کے سوز۔ اور اکبر کی چٹکیوں نے دلوں میں ایک تپش۔ ایک گدگدی سی پیدا کر دی تھی۔ اور طبیعتوں کو بے چین ضرور کر دیا تھا۔

• اقبال بھی حالی اور اکبر کے پیچھے پیچھے قوم کے بیدار کرنے میں مصروف

ہے۔ اور وہ بھی اسی درد سے بے قرار ہے جس سے حالی اور اکبر تڑپتے رہے تھے۔ اس کا بھی مقصد وہی ہے۔ جو حالی اور اکبر کا ہے۔ اقبال میں حالی کا سوز و گداز نہیں۔ اور نہ ہی اکبر کی میٹھی میٹھی چٹکیاں۔ ظرافت اور پھبتیاں ہیں۔ اس کے سوز میں ساز ملا جلا ہے۔ وہ روتا نہیں۔ اور کبھی روتا ہے تو اس کی اشکباری شبنم فشانی سے زیادہ نہیں۔ اور اس شبنم افشانی سے بھی اسے سوز میں ساز پیدا کرنے کا بھروسا ہے۔ اکبر کی طرح تہذیب حاضر کا وہ بھی مخالف ہے۔ اکبر کے انداز میں اس پر نکتہ چینیاں بھی کرتا ہے لیکن اس کی نکتہ چینیوں میں اکبر کی خراش و خلش نہیں۔ مگر اس کے بیان میں اک نرالا پن ہے۔ ایک جدت ہے۔ جو دوسرے شعراء میں نہیں۔ حالات حاضرہ پر ناراضگی بھی ہے۔ قوم کی ذلت پر رنج و افسوس کے آنسو بھی بہائے ہیں۔ اور گذشتگان کے کارنامے یاد دلا کر غیرت بھی دلائی ہے۔ مگر اسی پر اکتفا نہیں یاس و حرمان سے اسے عار ہے۔ مایوسی اس کا شعار نہیں۔ وہ مستقبل اور ایک شاندار مستقبل عقیدت کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اپنے مدہوش اور گم کردہ راہ بھائیوں کو۔ اس مستقبل کے جلوے دکھا کر۔ اور تہذیب نو کی نظر فریبیوں سے ہٹا کر۔ اسلام کی شاہراہ میں لے چلنے پر مصر ہے۔ اس کے فکر رسا نے قوم کی پستی اور گمرہی دیکھی ہیں۔ حالی اور اکبر کی مساعی جمیلہ کا اندازہ بھی کیا ہے۔ اور ان کی سعی کے مقصد کی تکمیل کے لئے یاروں کے سامنے دلکش مناظر رکھ دئے ہیں۔ جن کی جلوہ آرائیاں مدہوشوں کا تو کیا ذکر مُردوں میں بھی جان ڈالنے کی کفیل نظر آتی ہیں۔ اسے یقین کامل ہے اس کا مذہب ہے

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اس کی نظروں میں مسلمانوں کے ویرانوں میں آبادی۔ ان کی تباہی میں خوش حالی کے آثار نمایاں ہیں۔ ایران کی شکست ریخیت۔ بلغاریوں کی ترکتاز۔ عثمانیوں کے مصائب و آلام۔ اسے دل شکستہ نہیں کرتے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ ان ہنگاموں سے مسلم کی ہستی نہیں مٹ سکتی۔ وہ سمجھتا ہے۔ اس کا ایمان ہے۔ کہ مسلم کی ہستی "عریانی عالم کا پیرہن" ہے۔ اور اس کے مٹ جانے سے "رسوائی بنی آدم" اسے یقین ہے کہ فطرت "عریانی عالم" دیکھ نہیں سکتی۔ اور قضا و قدر کو "رسوائی بنی آدم" کبھی منظور نہیں ہو سکتی۔

"گورستان" تباہی میں وہ حسرت کے آنسو بہاتا ہے۔ اور زمانہ کی متلون مزاجی پر افسوس کے ہاتھ ملتا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک۔

اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشم تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیٔ گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے امید دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چکا ہے گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

فاطمہ بنت عبد اللہ کی شہادت بھی اس کا حقیقت آشنا دل غم کے آنسوؤں اور ماتم کے نالوں میں نشاط کی آب و تاب دیکھتا ہے۔ اور عشرت کے نغمے

سُنتا ہے۔

اس کا اعتقاد ہے۔ اور پختہ اعتقاد ہے۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور علی الاعلان کہتا ہے۔

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے
شکوہِ ترکمانی۔ ذہنِ ہندی۔ نطقِ اعرابی

اس کا عقیدہ ہے۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر نکلے اُدھر ڈوبے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس شاندار مستقبل کے حصول کے لئے اقبال نے سعی کی راہیں بھی بتا دی ہیں اور گمرہی کے رستوں سے جابجا متنبہ بھی کر دیا ہے۔

اصولِ اوّلین بتائے ہیں۔

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اور بعد میں تلقین ہے۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی

اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر!

تلامیذ الرحمٰن | شعراء تلامیذ الرحمٰن ہیں۔ اور کہا گیا ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

اقبال میں یہ خاصہ بدرجہا اولیٰ پایا جاتا ہے۔ اس کی حاسۂ باطنی حالات اور واقعاتِ ظاہری کو دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اس کا منشا ہر حقیقت کو بے نقاب پاتا ہے۔ اور اس کا کلام رازِ حقیقت کے انکشافات سے لبریز ہے۔

جو ہے مردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

اقبال کو ترجمانِ حقیقت کہا گیا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

ہم نے اقبال کی اس خصوصیت کے کرشمے اس کی مختلف نظموں میں دیکھے ہیں بچہ اور شمع۔ جگنو اور تارے۔ دریا اور پہاڑ۔ سب کے سب اسے حقیقت بتا دیتے ہیں۔ یہ سب کا رازدار ہے۔ زمانہ بھی اس کے سامنے بے حجاب ہو جاتا ہے۔ موجودہ تہذیب اسے اپنی عریانی کے ہولناک مناظر بھی دکھا دیتی ہے۔ اور مستقبل شاندار مستقبل اپنی ایک جھلک سے اسے محظوظ کر دیتا ہے۔ اقبال کا اپنے دعویٰ ہے۔

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہدِ کہن رکھتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے

مرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں

دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

ایک جگہ پر ہندوستان والوں کو متنبہ کرتے ہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنیوالی ہے

تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے

دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

ان کی نظم

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

اور شمع و شاعر کا آخری بند

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی الخ

اقبال کے آئینۂ تخیل میں استقبال کی تصویر دیکھنے اور ان کی روشن ضمیری کی بیّن مثالیں ہیں۔ انہیں اپنی اس قوت پر اعتماد کلی ہے۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے

وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

وہ اپنے سامعین اور ناظرین کو اپنی اس قوت کی سحر آفرینیوں سے مسحور کر کے آنے والے واقعات کی دھندلی سی تصویر دکھانے کا دعوے کرتے ہیں۔ صرف اس شرط پر کہ دیکھنے والے ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

بہت سی باتیں جو اقبال نے اپنی نظموں میں زمانہ آئندہ کے متعلق لکھی تھیں ۔ آنے والے دور نے ہو بہو دکھا دیں۔ مغربی تہذیب کا کھوکھلا پن۔ حریت کی عام لہر عربوں کی بیداری اور اقصائے عالم میں بے چینی۔ شاعر کی چشم بصیرت نے کئی سال پہلے دیکھ لئے تھے۔ اور سننے والوں کو متنبہ بھی کر دیا تھا۔ جنگ نے واقعات کے چہرہ سے پردہ اٹھا دیا۔ اور اب بچہ بچہ دیکھ رہا ہے۔ اس نے ۱۹۰۷ء میں دیار مغرب کے رہنے والوں کی تہذیب کی کم عیاری ظاہر کر دی تھی۔ اور پھر ۱۹۱۲ء میں صاف صریح الفاظ میں بتایا تھا۔

دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل

موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی

یہ وہ زمانہ ہے۔ کہ جنگ عالمگیر کا کسی کو خواب و خیال تک نہ تھا۔ یک بیک جنگ چھڑی۔ یورپ کی شائستگی اور انسانی ہمدردی نے عجب خوفناک صورتیں اختیار کیں۔ ہولناک نظارے پیش کئے۔ اور اقبال بڑے فخر سے ہمیں سنانے لگے۔

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج

موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

اقبال تو ہمیں ابھی تک یہ کہہ رہے ہیں ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

اور ان کا اسلامی درد سے گداز دل امید رکھتا ہے ۔ کہ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس

سامنے تقدیر کے رسوا رسوائی تدبیر دیکھ

اور مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

اور سچے مسلمان کے اطمینانِ قلب کے لئے مسلمان جو امانت توحید کا امین ہے۔ صاف الفاظ ہیں۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اقبال آنے والے دور کا شاعر ہے۔ اس کی آنکھوں پر اسرارِ حیات آشکار ہیں۔ اور رازِ حقیقت عیاں۔ اس کا تخیل چمنستان استقبال میں اسلام کی روشوں پر ابرِ رحمت کی بہار اور تختہ تختہ گل و گلزار دیکھتا ہے۔ اور غنا و مسرت کی سریلی صدائیں عقیدت کے کانوں سے سنتا ہے۔ نظارے دلفریب اور صدائیں دلکش ہیں۔ دیکھنے والا محو ہو رہا ہے۔ سننے والا مست ہے۔ وجد کا عالم ہے۔ اور شاعر اسی وجد کے عالم میں اپنی ترنم ریزیوں سے جادو کے پھول برساتا ہے۔ اہل مجلس مسحور ہو رہے ہیں۔ اور شاعر کے دوش بدوش دورِ حاضرہ کی بے بسی۔ اور رسوائیوں کی دسترس سے کہیں پرے جنت نگاہ اور فردوس گوش کے مزے لے رہے ہیں۔ اور شاعر کے ساتھ ہمنوا ہیں۔

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد

سرت گردم تو ہم قانون پیشیں سازدہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخ خلیل از خون ما نمناک می گردد
ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاک شہیدے برگہائے لالہ مے پاشم
کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد
بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

خودی۔ خودداری اور خود افزائی

مہمات کلام اقبال میں خودی۔ خودداری۔ اور خود افزائی کی تعلیم ہے۔ اقبال دیکھتا ہے۔ کہ مسلمان رسوائی اور ذلت کے گڑھوں میں سسک رہے ہیں۔ اور ان کی ذلت۔ ان کی رسوائی۔ ان کے اپنے سکوت۔ سکون۔ اور جمود کا نتیجہ ہے۔ کم ہمتی کی عادت۔ اور بے مقدوری کے خیال نے یہ حالات پیدا کر دئے ہیں۔ اور جب تک یہ عادت۔ یہ خیال موجود ہے۔ کوئی صورت ان کے پنپنے کی نہیں۔

اقبال کو یقین ہے۔ اس نے عین الیقین سے دیکھا ہے۔ کہ مسلم کا مستقبل شاندار ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے۔ کہ اس شاندار مستقبل کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ محسوس کرے۔ کہ [illegible] حیثیت کیا ہے۔

وہ کیا کچھ ہے۔ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اور اسے کیا کچھ کرنا ہے۔ وہ کمر ہمت باندھ لے۔ اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چل کر خلافت الٰہیہ کے اہم فرائض ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔

حصول مراد کے لئے بڑا گُر جو اقبال بتاتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

[illegible] قید نہیں۔ خاموشی اور بے اعتنائی کی خودداری نہیں۔ صرف یہی خودداری نہیں جو زبان سوال نہیں ہلاتی۔ جو طلب و حاجت کے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ بلکہ خودداری یہ ہو کہ پروانہ نادان کی طرح طواف شمع کی گرویدہ نہیں۔ اور حضرت کلیمؑ کی طرح طور کی چوٹیوں پر متمنی جلوہ حقانی نہیں۔ خودداری جو خود اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو۔ اپنی ہستی سے شعلۂ سینائی عیاں کر سکے۔ اپنے سینہ میں لمعات انوار الٰہی۔ اور اپنے دل میں تجلیات فیوض ربانی سے مالامال ہو۔ خودداری جو دوسروں کی کسی طرح دست نگر نہ ہو۔ جو اغیار کے استکبار اور تفاخر کی خدمتگذار نہ ہو۔

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

اغیار کے تصدقات کا پہلو نظر انداز کر کے بھی اقبال مسلم کو تلقین کرتے ہیں۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

دل ہلا دینے والے الفاظ! خودی کی اس محترم ابتدا اور مقدس انتہا کے حوالہ سے کون سا جسم ہے جس میں سنسنی نہ پھیل جائے۔ کونسی روح ہے جو تڑپ نہ اٹھے۔ ایسی عالی نسبت کا اشارہ ہی سکوت کی مہر توڑنے کے لئے کافی ہے۔ اور سکون و جمود کی زنجیریں ریزہ ریزہ کرنے کے لئے وافی۔

صاحب کمال شاعر نے اس سنسنی اور تڑپ میں ممکنات زندگانی کے جوہر دیکھے ہیں۔ اور اپنی سحر طرازیوں کے ہنر سے انہیں چمکانے کا سامان بہم پہنچانے کی کوششیں کی ہیں۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت
اے تغافل پیشہ! تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

خودی اور خودداری کے ساتھ ساتھ ہی خود افزائی کی تعلیم بھی ہے مسلم کو بتایا گیا ہے کہ وہ کیا ہے۔ اس نے کیا کچھ کرنا ہے۔ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس

کا طریق عمل کیا ہونا چاہیئے۔

پھر باد بہار آئی اقبال غزل خواں ہو
غنچہ ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے
برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

خود افزائی کی یہ تلقین شاید نامکمل ہوتی۔ اگر فصاحت و بلاغت کے الفاظ میں پورے وثوق سے یہ امر ذہن نشین کرانے کی کوشش نہ کی جاتی۔ کہ

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے!
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے!
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے!
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمار جہاں تو ہے!
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے!
جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے!
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے!

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس کی خودداری حاجت کا ہاتھ پھیلانے سے عار کرتی ہے۔ اس کی بے پری فضائے عالم میں اڑنے کے لئے تخت سلیمان کا سہارا لینا بھی ننگ خیال کرتی ہے۔ اس کے مذہب میں دست و بازو توڑ کر بیٹھے رہنا ایسا تکلیف دہ نہیں۔ مگر مومیائی کی گدائی سے اسے سخت نفرت ہے۔

دریوزہ خلافت جنگ عالمگیر کے بعد خلافت کے لئے مسلمانوں کی سعی۔ اور بالخصوص مسلمانان ہند کی دوڑ دھوپ۔ زبان سوال۔ اور دست طلب کی جدوجہد نے ایک عالم میں شور مچا دیا تھا۔ اور دنیا بھر میں ہلچل ڈال دی تھی۔ اقبال حقیقت کا رازدان۔ اور سنن فطرت کا واقف کار۔ اپنے نادان دوستوں کی سعی لاحاصل پر ہنستا تھا۔ اور اس کی اسلامی حمیت خلافت کی دریوزہ گری سے نالاں تھی۔ اس نے انہیں صاف صاف بتایا کہ

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

پیغام عمل نظم اردو۔ فارسی شاعری کی صدائے بازگشت رہی ہے اور

پھیکی سی نقالی- ایران کئی صدیاں آسائش اور تعیش کی زندگی میں رہا- اور طبعاً بھی کچھ عیش پسند واقع ہوا ہے- ملک کے گل و گلزار- سبزہ و جو- ساقی اور مے نے اہالیان ملک میں ایک سرخوشی پیدا کر دی- اور طبیعتوں میں عیش اور آرام کی روح پھونک دی- دل مینا اور مے سے گرم اور ہاتھ پاؤں سکون سے سرد ہو گئے- شاعری نے بھی وہی رنگ اختیار کر لیا- شاعری میں مینا کی قلقل مے کی مستی- گلزار کے بلبل نے اودھم مچا دیا- اور مذاق عامہ اشعار میں بھی عیش و آرام اور سکون کا گرویدہ ہو گیا-

ہمارے ہاں اردو شاعری نے بھی بد قسمتی سے وہی ماحول پائے- وہی محفلیں- وہی رونقیں تھیں- وہی راگ الاپنا شروع کیا- اور وہی نتائج پیدا کئے- غم و الم- یاس و نومیدی- اس کی تعلیم میں تھے- کچھ آب و ہوا نے بھی مدد کی- سکون و جمود اس تعلیم کے یقینی اثرات ہوئے-

اقبال نے غم و الم- یاس و نومیدی کو امید کی جھلک دکھا کر قوم کا دل بڑھایا- اور سکون و جمود کی بجائے عمل کی تلقین کی-

کلام اقبال شروع سے لیکر آخیر تک پیغام عمل سے گونج رہا ہے-

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق گرم تقاضا تو بھی ہو

غفلت کی نیند کے ماتوں کو بیدار ہونے کے لئے کہا گیا ہے- اور بیدار ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے لئے نہیں- بلکہ ہنگامہ آرائی کی ہدایت ہے- شور و شغب کی ہنگامہ آرائی نہیں جو اور تہذیب کی جلوہ پیرائیوں میں خود فروزی کے کرشمے دکھائے- اور زندگی کے تقاضائے ارتقا میں کشمکش کی ادھیڑ بن میں شامل ہو- سکوت و سکون- یاس و حرمان سے بیزار ہو- اور دنیا کی رواداری میں

گرم رفتار۔ تصویر درد۔ شمع و شاعر۔ خضر راہ۔ اور طلوع اسلام پیغام عمل سے بھری پڑی ہیں۔ اور جواب شکوہ میں بھی پیغام خدائی آواز سے پہنچایا گیا ہے۔

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اور پھر اس درگاہ کبریائی سے ارشاد ہو رہا ہے۔

مثل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اجالا کر دے

دوسری نظمیں بھی رنگ رنگ کے پردوں میں یہی راگ گاتی ہیں۔ جا بجا بار بار مسلم ناداں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ اس کی ہستی کا مقصد کیا ہے۔ قضا و قدر نے اس سے کیا کام لینا ہے۔ اور اس کام کی اہلیت اس میں کہاں تک پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کا احساس بے مقدوری اس کی تباہی کا باعث ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ قادر مطلق نے اس کی فطرت میں شاندار امکانات زندگانی ودیعت کر دی ہیں۔ اگر یہ دل چھوڑ کر بے جانوں کی طرح گھر میں نہ پڑا رہے اور اپنی ہستی کا مقصد پورا کرنے کے لئے میدان عمل میں نکل آوے۔ تو اس پر اپنی حقیقت آپ ہی کھل جائیگی۔ ابھی تک اسے پتہ نہیں۔ یہ سمجھا نہیں —

سمجھ

یقین محکم۔ عمل پیہم۔ محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اور اس دنیا میں رہنے کے لئے۔ عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے۔ نگاہ پاک بینے۔ جان بیتابے

بے تاب جان کیوں ہو؟ ہمارے فلسفی شاعر ہمیں بتاتے ہیں۔ یہی بے تابی۔ زندگی ہے۔ اگر بے تابی نہ ہو۔ تو زندگی کا خاتمہ ہے۔ اور موت یقینی۔ آپ نے آئین قدرت کا مطالعہ کیا ہے۔ اور یہی نتیجہ نکالا ہے۔

بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہم دن رات دیکھ رہے ہیں۔ کہ کشاکش اصول زندگی ہے۔ اور راہ حیات میں دھم دھکا۔ گھتم گھتا۔ اسے گرایا۔ اسے دے پٹخا۔ یہاں ٹھوکر۔ وہاں ٹکر۔ مگر رواروی۔ چلا چل۔ رستہ کا آئین ہے۔ جو اس آئین سے بے خبر ہیں۔ اس پر عمل پیرا نہیں۔ ان کا رستہ کتنا مشکل ہے۔ ان کا قدم آگے بڑھنا محال ہے اور ایسی صورت میں کونسا راہرو ہے۔ جو اس حقیقت سے ناآشنا ہوگا۔

اس راہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
شتہ ہے نقارے کی چوٹ بتا رہی چلنے والے نکل گئے ہیں
کیونکہ جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اسرار ازل کے راز داں نے زندگی کو "تگاپوئے دمادم" سے تعبیر کر کے زندگی کا راز "عمل" میں ہی بتایا ہے۔ اور پھر اسی "تگاپوئے دمادم" کی جزو اعظم "نفس گرم" کے جان افزا اثرات کا پتہ دیا ہے۔ کیا ہی انداز ہے۔

نفس گرم کی تاثیر ہے انعام حیات
تیرے سینے میں اگر ہے تو مسیحائی کر

عمل ہمیں بتایا گیا ہے آئین قدرت ہے۔ اور بالخصوص انسان کی ہر قوت ذوق عمل میں سرگرم تقاضا ہے۔ اور

جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

زمانہ کے ساتھ نہ چلنے والے۔ پرانی لکیر کے فقیر۔ اپنے اس رویہ سے جو نقصانات اٹھاتے ہیں۔ جو زحمتیں برداشت کرتے ہیں۔ اظہر من الشمس ہیں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں
یہ کارواں ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

سکون۔ اور سکوت۔ اس کشمکش وجودی کے عالم میں۔ تباہی اور ویرانی کے آثار ہیں۔ یہاں تو اگر اور کچھ نہیں۔ ہمارے شاعر ہمیں بتا رہے ہیں۔

طرب آشنائے خروش ہو تو نوائے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں

ارتقا کے عنوان کے نیچے کشاکش حیات کی تصویر بوقلموں دلآویز رنگ آمیزیوں سے کھینچی ہے۔ جو انفرادی اور قومی زندگی میں عمل کی اہمیت دلچسپ پیرایہ میں

ظاہر کرتی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی!
سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی!
کشاکش زم و گرما تپ و تراش و خراش
ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی!
مقام پست و شکست و فشار و سوز و کشید
میان قطرۂ نیساں و آتش عنبی!
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی!
مغاں کہ دانہ انگور آب مے سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اقبال کے مذہب میں عمل زندگی کا اصل اصول ہے۔ اور اس کے نزدیک ہماری روحانی ترقی اور تنزل بھی عمل سے ہی وابستہ ہے بہشت کی نعمتیں دوزخ کا عذاب۔ اسی عمل کا نتیجہ ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مذہب (۱) مذہب کے ذیل میں شکایات کا ایک دفتر ہے۔ جو اقبال کی نغمہ پیرائیوں

نے مسلمانوں کو غیرت دلانے کے لئے کھول دیا ہے۔

مسلمان ہیں۔ کہ ان کے دل الحاد سے خوگر ہو رہے ہیں عجمیت کے گرویدہ۔ کفر کے بندے۔ شعار اغیار کے شیدائی۔ طرز سلف سے بیزار۔ وضع میں نصاریٰ۔ تمدن میں ہنود۔

گذشتی ساز معمور نواہائے کلیسائی

ان کی طبع آزاد رمضان کی پابندیوں سے گریزاں ہے۔ اور نمازیں جن سے دنیا میں سطوت توحید قائم ہوئی تھی۔ ہندمیں نذر برہمن ہو چکی ہیں۔ بت گری ان کا پیشہ اور بت پرستی ان کا شیوہ۔ "تارک آئین رسول مختار، مصلحت وقت کے غلام۔ قلب میں سوز نہیں۔ روح میں احساس نہیں۔

مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے
بت ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے

شوق پرواز میں اپنے نشیمن سے کہیں دور جا پڑے ہیں۔ عمل تو پہلے ہی نہ تھا اب ان کے معتقدات بھی متزلزل ہو رہے ہیں۔ تہذیب نے انہیں ہر بند سے آزاد کر دیا ہے۔ اور ان خدا کے بندوں نے کعبہ چھوڑ کر صنم خانہ میں ہی اقامت کی ٹھہرا لی ہے۔

ان کا نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار میں جا چکا ہے۔ اور مئے مغربی نے ان کے دلوں میں اسلامی جذبات کے ہنگامے خموش کر ڈالے ہیں۔ کہیں فرقہ بندیوں کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ اور کہیں ذاتوں کی آویزش۔ پرانے سلیقے اب کہاں۔ اور پرانے طریقے اب کون جانے۔ کلیم کا سلیقہ نہیں خلیل کا قرینہ نہیں۔ ایک فریق اگر جادوئے سامری کا دلدادہ ہے۔ تو دوسرا فریق شیوہ آذری کا پیرو۔

اسلام کے نام لیوا تو ہیں مگر قرآن سے انہیں رغبت نہیں۔ اللہ سے الفت نہیں۔ رسول ؐ کے نام سے انس نہیں۔ اور پیغام محمدؐ کا پاس نہیں۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالیؒ نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

مسلمان ہیں۔ کہ ان کا لبیف شرعیہ سے گھبراتے ہیں۔ اسلام کی سیدھی سادھی زندگی کو نگاہ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ تہذیب نو کی سوسائٹی کے عاشق ہیں۔ اور اس کے آئین کے گرویدہ۔ بے حجابی پر مرتے ہیں۔ اور آزادی حسن پر مفتون ہو رہے ہیں۔ مذہب میں تہذیب حاضر کی ویران کاریاں کیا ہی پر درد انداز میں بیان کی ہیں۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ

کس قدر دلکش اور دلخراش پہلو ہے۔

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

قوم کی اس یاس وحرمان کی زندگی میں ان کے پھر پنپنے کے لئے اب تو یہی بنتی

معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔

"تخم دیگر بکف آریم و بکاریم ز نو
کانچہ کشتیم زخجلت نتواں کرد درو"

اور مسلم کو اگر خدا توفیق دے تو اقبال کی تعلیم ہے۔

ہاں! اسی شاخِ کہن پر پھر بنا لے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر

مسلم کی ہستی کے قیام و دوام کے لئے اسے واضح کر کے بتایا گیا ہے۔ کہ وہ ذوق یقین پیدا کرے۔ پختگیٔ ایمان حاصل کرے۔ اور پھر دیکھے۔ کہ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اور کیا ہے جو نہیں کر سکتا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

مسلمانوں کو مذہب کی اہمیّت سے متنبہ کیا ہے۔ اور اسلامی جمعیّت کا اقوام مغرب کی ترکیب سے مقابلہ کر کے نوجوانانِ اسلام کو اس کے اصل اصول سے آگاہ کیا ہے۔

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اقبال توحید کا عاشق ہے۔ وہ حق کا طالب ہے۔ جہاں کہیں ہو جس قدر بھی ہو اس پر قربان ہے۔ اس کے مذہب میں فراخ دلی اک نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ حقیقت کی ترجمانی میں تنگ نظری نہیں دکھاتا۔ یہاں راجہ رام چندر جی کے جوشِ محبت۔ ان کی شجاعت اور ان کی پاکیزگی کا مدحت سرا ہے۔ اور وہاں مہاتما بودھ کی حق جوئی اور حق نمائی کا شیدائی۔ بابا نانک کی صدائے توحید کا نقارہ بجا رہا ہے۔ اور خدا سے غافل ہند کو اس مردِ کامل کے آوازۂ وحدانیت کی برکتوں سے بیدار پاتا ہے۔ اور خوش آمیز سروں سے جاگنے والوں کو محظوظ کر رہا ہے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اخلاقیات اخلاقیات میں مسلمانوں کی پستی کی کوئی حد نہیں رہی۔ اور اقبال نے بھی اس کی خوفناک گہرائیاں ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک دکھا دینے میں کوتاہی نہیں کی۔ تعصب۔ فرقہ آرائی۔ حرص و ہوا۔ تن آسانی نے انہیں ذلیل کر دیا ہے۔ اور قوم پرست شاعر انہیں مختلف پیرایوں میں ان عادات اور دیگر عاداتِ قبیحہ سے متنبہ کرتا ہے۔ اور غیرت۔ خودداری استغنا۔ صداقت۔ عدل۔ حیا۔ شجاعت۔ رحم و کرم۔ خطا پوشی۔ اخوت اور اخلاص کی جو مسلمانوں میں نایاب صفات ہو رہی ہیں۔ بڑے زور سے تعلیم دیتا ہے۔

کیا ہی سنہری اصول ہیں۔

اس گلستاں میں نہیں حد سے گذرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

اور

پہلے خوددار تو مانند سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوس شوکت دارائی کر

مسلمانوں کو ہر ایک مرحلہ حیات پر مختلف مدارج زندگانی میں کمال پیدا کرنے کی ترغیب ہے۔ اور کس خوبی سے ترغیب دی ہے۔

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینہ میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

علو ہمتی کی تعلیم بار بار ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

اور اسی سلسلہ میں ارشاد ہے۔ کہ

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اقبال نمود کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک زندگی کا مقصد محض نمود سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثال شرار ہوگا

ہاں شرر کی زندگی میں بھی ایک خوبی کی بات ہے اگر وہ مد نظر ہو تو نمونہ تقلید کے قابل ہوگا۔ اقبال کی تلقین ہے

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام
سیر اس باغ کی کر باد سحر کی صورت

نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام
زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت

محبت نوع انسان اقبال کی شاعری کی روح ہے۔ اور اسی محبّت نوع انسان پر وہ بار بار زور دیتا ہے۔

شراب روح پرور ہے محبّت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

اور کیا ہی خوب کہا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اقبال لڑکیوں کو نئی تعلیم دینے کا حامی نہیں۔ وہ تہذیب نو کے اثرات سے انہیں محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مدِّ نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائیگا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اور پردہ اُٹھ جانے پر تو اس کی نکتہ رس نگاہ صرف دیکھ رہی ہے اور با آواز بلند کہہ رہی ہے۔

عزّت ہے محبّت کی قائم اے قیس حجابِ محمل سے
محمل جو گیا عزّت بھی گئی غیرت بھی گئی لیلیٰ بھی گئی

سیاسیات — اقبال کا مذہب اسلام ہے۔ اور اس کی سیاسیات آئین اسلامی کے تابع ہیں۔ رسول عربی کے دربار میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی بندہ نہیں کوئی بندہ نواز نہیں۔

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہاں اخوت و مساوات اپنے حقیقی معنوں میں کارفرما ہیں۔ مسلم کا عقیدہ ہے۔ اور اقبال اسے کھلے لفظوں میں بتا بھی رہے ہیں۔

جو کریگا امتیاز رنگ و خون مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

اقبال توحید اور اخوت کا علم بردار ہے۔ وہ ساری دنیا کو بلا امتیاز رنگ و خون رشتہ اخوت میں وابستہ دیکھنے کا متمنی ہے۔ اور اقوام عالم میں سلسلہ مودت کے قیام کا خواہان۔ اقبال نے دیکھا ہے۔ کہ مغرب کے جمہوری نظام میں در پردہ وہی قیصریت کی راگنیاں ہیں۔ جن کے سامنے کسی دوسری آواز کی مجال شنوائی ہو رہی ہے۔ فقط نام کی آزادی ہے۔ عام حریت جو اسلام نے سکھائی تھی۔ اور جس کے عالیشان نمونے سلف اسلام کی تاریخ میں جا بجا نظر آرہے ہیں۔ اب کہیں دکھائی نہیں دیتی — موجودہ سیاسیات کا مطمح نظر اقتصادی تصرف ہے۔ اور اس میں آزادی اخوت۔ اور مساوات کے دعوے محض دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ اقبال اقتصادیات کے آوردہ اور پروردہ نظام اور تمدن کا قائل نہیں۔ وہ

علی الاعلان بتا رہا ہے۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

البتہ آزادی کا عالمگیر تموج جواب تختۂ دنیا کو تہ و بالا کر رہا ہے ممکن ہے کہ اپنے جوہر دکھائے۔ اقبال کی نکتہ رس نگاہ تو اس میں نوع انسان کی باہمی اخوت اور اقوام عالم کی سچی آزادی کا چڑھاؤ تاڑ رہی ہے۔

عام حریت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

آزادی کا نظریہ جو اقبال کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ خود یوں بیان کرتے ہیں۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا
شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

اور

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

اقبال آزادی۔ انفرادی اور قومی کا حامی ہے لیکن اس کا عقیدہ ہے۔

دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

وہ آزادی کے لئے آئین کی پابندی لازمی سمجھتا ہے۔ اس کے ذہن میں حریت کی بنیاد اطاعت پر ہے۔ اور جو آزادی ربط و ضبط سے آزاد ہو آزادی

نہیں۔ طغیان ہے۔ اور اس کا انجام معلوم۔ حقیقی آزادی تو انسان کے اپنے ضمیر۔ دل۔ اور جگر کا حاصل ہے۔ اور علائق کی پابندیوں میں بھی میسر ہو سکتی ہے۔ تزکیۂ نفس درکار ہے۔ اگر یہ ہو جائے۔ تو پھر کوئی دقت نہیں۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے

انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

اس کے نزدیک حقیقی آزادی کے لئے۔ طبع بلند۔ مشرب ناب۔ دل گرم۔ نگاہ پاک ہیں۔ اور جان بے تاب شرط ہیں۔ اور خود گذاری لازمی۔ ان کے بغیر آزادی نہیں۔ بلکہ اس کے لئے ہاتھ پیر مارنے بھی باعث تباہی و بربادی ہوگا۔ اور ان ہی شرائط اور حالات کو مدنظر رکھ کر اقبال ہند میں سیاست سری اور بے ہنگام شورشوں کے برخلاف ہے۔ اور اس کا مشورہ ہے۔

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی

رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

شمع و شاعر قومیت اور سیاسیات پر ایک معنی خیز خیال بندی ہے جس کی ضروری تفاسیر مناسب محل پر کر دی گئی ہیں۔

نیا شوالہ اور تصویر درد بھی سیاسیات کے ایک پہلو پر چھینٹے بتاتے ہیں۔ اور ہندوستان کی پھوٹ کی تلخیوں سے محبان وطن کو بے تاب کئے دیتے ہیں۔

خضر راہ میں اقبال نے دنیا کی موجودہ سیاسیات پر اظہار خیالات کیا ہے اور ایک عجیب دلربایانہ انداز سے ان کی اصلیت بتائی ہے۔ سلطنت کی حقیقت اس کے ساحرانہ کرتب۔ جمہوری نظام کی فسوں سازیاں۔ قیصریت کے نظر فریب بہروپ دلکش مرقعوں میں دکھائے ہیں مجالس آئین و اصلاحات۔ رعایات و حقوق

کی شعبدہ بازیاں بے نقاب کر دی ہیں۔ مزدور کی کمر شکن محنت اور سرمایہ داروں کے غیر منصفانہ تصرف کے یاس انگیز نظارے۔ سرمایہ داروں کی بہیلدی بیاری خون آشام زبان پر مزدور کی جان بازیوں کے کرشمے اور غریب کی انتہائی سادگی کے سرمایہ پر امراء کی تجارت کے خونخوار کارنامے نئے نئے پیرایوں میں بیان کئے ہیں۔ وہ تہذیب حاضر کی صناعی کو چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کے برابر تصور کرتا ہے۔ اور مغربی سیاسیات کی بنا ہوس پر مبنی سمجھتا ہے اس کے نزدیک

ولایت، بادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اور اس کے عقیدہ کے مطابق۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تہذیب نو اکبر کی طرح اقبال بھی تہذیب نو کے خلاف ہے۔ وہ بھی اس نئی روشنی کی پروانگی اور شیفتگی میں اسلامیوں کی نکبت اور فلاکت کے آثار دیکھتا ہے۔ قوم کو اس کی فتنہ سامانیوں سے گوناگوں اسلوبوں میں آگاہ کرتا ہے۔ اور اس کی تباہ کاریوں سے خبردار۔ وہ دیکھتا ہے کہ تہذیب حاضر کی تعلیم پر ایک دنیا والہ و شیدا ہے۔ اور مسلمان بھی رہنمایان قوم کے زیر اثر اس پر سو جان سے قربان ہیں۔ نئی تعلیم امراض ملت کی دوا سمجھی گئی ہے۔ اور اس دنیا کے مختلف مراحل زندگی میں رہرو کے لئے زاد راہ و سامان سفر۔ اقبال تعلیم اور اس کی اہمیت کا قائل نہیں۔ وہ اس کے اثرات بد محسوس کر رہا ہے اور شکایت کرتا ہے۔

رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیل فرمان خضر

لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری
رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اس کی شکایت کے لئے وجوہ بھی ہیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اور اس کی حکمت پژوہ نگاہ دیکھتی ہے۔ کہ نئی تعلیم کا لابدی نتیجہ ضعف ایمان اور اختلال عقائد ہے۔ علوم جدید کی بنا محسوس پر ہے۔ اور معبود غائب۔ اس کے ادراک سے باہر۔ کون نہیں دیکھ رہا ہے۔ کہ اس دور میں عقائد کا شیشہ پاش پاش ہو رہا ہے۔ کون سا دل ہے۔ جو نور ایمان سے منور ہو۔ یہ حالت دیکھے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ اس میں کلام نہیں۔ اور اقبال اس سے بے خبر بھی نہیں۔ کہ تہذیب حاضر میں بلا کی حرارت ہے۔ اس کی تب و تاب سے ایک جہاں جگمگا رہا ہے۔ اور پہنائے عالم میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بیباکی

تدبر کا نام و نشان نہیں رہا۔ تخیل عنقا ہے۔ ہمدردی کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ اور پیش تعلیم بربادی کی تصویریں ساحرانہ چالاکی سے دل کشا مناظر کی صورت میں دکھا رہا ہے۔ رقابت۔ خود فروشی۔ ناشکیبائی۔ ہوسناکی۔

تہذیب نو کی لذتیں ہیں۔ اور بزم مسلم کی رونقیں۔ ہمارا کہنہ ادراک فلسفی شاعر مسلم کو تہذیب حاضر کی جھوٹی چمک سے خبردار کرتا ہے۔ اور ان مستعار رونقوں اور ویراں کار محفل آرائیوں سے متنبہ۔

تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمع محفلے داری

چو من در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری

عہد نو کو برق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور مسلم کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اس کی چمک دمک پر فریفتہ نہ ہو۔ اس کے قریب سے پرہیز کرے۔ اس کی عالم سوز خاصیت سے غافل نہ ہو۔ جو نزدیک آئے۔ اسے جلا کر راکھ کر دینا اس کی جبلت میں ہے۔ کوئی خرمن اس سے مامون نہیں۔ کوئی صحرا بچا ہوا نہیں۔ کوئی گلشن محفوظ نہیں۔ اس نئی آگ کی طرار زبان۔ اس کے دیدہ فریب شعلے۔ اقوام کہن کو چاٹ رہے ہیں۔ اور انہیں چاٹ چاٹ کر صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔ اور بالخصوص۔

ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن ہے

اس نئی آگ کی اس آتش باری میں۔ اس ویران کاری میں۔ ایمان کی استمداد درکار ہے۔ براہیمی ایمان کی۔ کیونکہ اسلامیوں کے عقیدہ کے مطابق۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا

آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

اقبال دیکھتا ہے۔ کہ نئی روشنی کے دلدادہ رہنمایان ملت بن بیٹھے ہیں اور حالت یہ کہ خدا اور اس کے رسول ص سے ناآشنا۔ شعائر اسلامی سے نابلد محض تارک آئین آبائی۔ حرم کعبہ سے گریزاں۔ دیر کے دلباختہ۔ تہذیب مغرب کے زائر۔ ان کا کام سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ مسلموں کو بگاڑ کر اپنی

عزت بنا ہیں۔ انہیں خدا کا ڈر نہیں کہ یہ اس کے پیارے نبی کی اُمت کی بنا مٹا رہے ہیں۔ انہیں اللہ کا خوف نہیں کہ خیرالامم کو ذلت و رسوائی کے گڑھوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔

اس رنج و غم کے ہجوم میں اقبال نے رسول اکرم کے دربار میں ایک شوریدہ صدا میں فریاد کی ہے۔

کل ایک شوریدہ خوابگاہ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائران حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں
غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تیری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
سنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

اقبال تہذیب نو کی کم عیاری دیکھتا ہے۔ اور اپنے ہم مشربوں کو اس کے زہر آلود رواج سے مامون و مصئون رکھنا چاہتا ہے۔ وہ دلیرانہ اور پورے وثوق سے کہہ رہا ہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

تصوف کلام اقبال میں صوفیانہ انداز ہر ایک مرحلہ پر نمایاں ہے اور

اندازِ بیان میں بے اندازہ لطافت اور رنگینی پیدا کر دی ہیں۔ اقبال خود بھی اپنے اس صوفیانہ انداز کی طرف صریح و صاف لفظوں میں اشارہ کرتے ہیں۔ اور اس پر نازاں بھی ہیں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں
زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر چھپی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں
مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اقبال نے تصوف کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ اور فلسفہ کی صحبتوں میں تربیت حاصل کی تھی۔ ناممکن تھا کہ اس کی شاعری ان کیفیات و حالات سے متاثر نہ ہوتی۔ تصوف اور حکمت کے امتزاج نے اشعار میں وہ سحر بیانیاں دکھائیں۔ اور وہ مضمون آفرینیاں کیں۔ جو ادبیات اردو میں کمیاب ہیں نگاہ نکتہ بیں مدتوں خارستاں میں نظارۂ گل کی متمنی رہی۔ اور ظلمت میں روشنی کی متلاشی اور بالآخر شب کی سیہ پوشی میں حسن کی وہی جھلکیاں دیدہ فروز معلوم ہوئیں۔ جو مہر کی ضو گستری میں چھپی تھیں۔ اور قدرت کے ہاتھ نے

کانٹے کی کھٹک سے دل انسان میں وہی گدگدی کی لذّت پیدا کردی + جو اس کے دماغ کو پھول کی مہک سے حاصل تھی۔

اقبال محسوس کرتا تھا۔ اور اس احساس کے دل ہی دل میں مزے لیتا تھا۔ کہ رازِ قدرت کی جستجو میں لذتیں ہیں۔ جو زندگی کے کسی اور سلسلۂ تگ و دو میں نہیں۔ اسے مظاہرات قدرت میں وہ اسرار چھپے ہوئے معلوم دے رہے تھے۔ جن کے انکشاف پر ایک نئی دنیا سامنے آجائے۔ اس نے مشاہدہ کر لیا تھا۔ کہ

لیٹنا زیرِ شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

اور انہی مشاہدات کے مقابلہ میں فلسفہ کی حیرت طلبی بھی عیاں تھی۔

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

تصوف اور حکمت کے ڈانڈے اس قدر ملے جلے ہیں۔ کہ بسا اوقات ان میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اقبال کی نکتہ رس اور نکتہ آفریں طبیعت نے "عقل و دل" کے مکالمہ کی صورت میں اس پیچیدہ عقدہ کو ایسی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے۔ کہ خود تصوّف اور حکمت کی مورتیں آمنے سامنے کھڑی ہوئی داد دے رہی ہیں۔

دل نے تصوف کی طرف سے کس خوبی اور فصاحت سے سارا معاملہ من وعن بیان کر دیا ہے۔ اور عقل کو جو حکمت کی نام لیوا ہے۔ مخاطب کر کے جانبین کی حیثیت کما حقہٗ بتا دی ہے۔

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے

اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

انداز بیاں ملاحظہ ہو کس خوبی اور لطافت سے تصوف اور فلسفہ میں فرق ظاہر کیا ہے۔

عقل فلسفہ کی کارپرداز ہے۔ اور دل تصوّف کا محرم راز۔ فلسفہ حقائق اشیاء سمجھتا ہے۔ مدرکات سے استدلال کے ذریعے اشیاء کی حقیقت اخذ کرتا ہے۔ تصوّف۔ فلسفہ کے ذرائع علم کا محتاج نہیں۔ وہ حواس خمسہ اور استدلال سے مستغنی ہے۔ وہ حاسۂ باطنی کی وساطت سے۔ حاسہ جو حکمت اور فلسفہ کو میسّر نہیں۔ واقعات و حالات کا ادراک کرتا ہے۔ وہ باطن کی آنکھ سے ہر ایک چیز دیکھ لیتا ہے۔ حکمت مظاہر پرست ہے۔

اور تصوف حقیقت آشنا حکمت کا نتیجہ علم اشیا ہے۔ اور تصوف کا ماحصل معرفت خدا۔ حکمت خدا جوئی میں مصروف ہے۔ اور تصوف حق نمائی میں۔ وہ سراسر بے تابی ہے۔ اور یہ اس بے تابی کی دوا۔ وہاں پریشانیاں ہیں۔ اور یہاں اطمینانِ قلب۔ حکمت صداقت کی مشعلیں گرماتی ہے۔ اور تصوف حسن کی مجلس کا چراغ ہے۔ حکمت زمان و مکان کے سلسلہ سے پابجولاں ہے۔ اور تصوف کی پرواز اسے اعلیٰ علیین تک پہنچاتی ہے اور تصوف کو اپنی اس بلند پروازی اور رسائی پر ناز ہے اور مفاخرت۔

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرش رب جلیل کا ہوں میں

کہا گیا ہے کہ عشق حقیقی تصوف کا مایۂ خمیر ہے۔ اور اہل دل خوب سمجھتے ہیں کہ حسن عشق کی جان ہے۔ اور حسن کامل عشق حقیقی کی روح رواں اقبال خود قائل ہے۔ کہ حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عشق نے شاعر کے دل کو ذوقِ تپش سے آشنا کر دیا ہے۔ اور اس کی آشفتگی سے۔

دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رستخیز
وہ حیرت کی آنکھ سے دیکھتا ہے کہ
محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایاں حسن

آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں۔ مہر کی ضو گستری میں۔ شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی اور شب کی سیہ پوشی میں حسن ہی حسن ہے۔ دریا کی آزادی۔ ساکنانِ صحن گلشن کی ہمنوائی ننھے طائروں کی آشیاں سازی حسن سے لبریز ہے۔

شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں، آبادی میں حسن

صرف یہاں تک ہی نہیں بلکہ

عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ ناآشنا کی کوشش گفتار ہیں

حسن ہی حسن ہے۔

حسن کے اس عام جلوے میں شاعر پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ

کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی

وہ دیکھتا ہے کہ ہر چیز میں حسن ازل کی جھلک پیدا ہے۔ غنچہ میں چٹک۔ انسان میں سخن۔ اسی جھلک کے برقی کرشمے ہیں۔ نغمۂ بلبل۔ اور بوئے گل۔ محض انداز گفتگو کی دمبازی ہے۔ ورنہ

نغمہ ہے، بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے

اور نگاہ نکتہ رس تاڑلیگی کہ

جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

ایک دو مزید مثالیں توجہ طلب ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا۔ کہ شاعر کمال فن نے اسی مسئلہ کو کن کن اداؤں سے نباہا ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دل چیریں

یہاں تک تو خورشید اور ذرّہ میں کوئی نسبت تھی۔ لیکن ہمارا شاعر جذبات صوفیانہ میں اس پر مطمئن نہیں ہوا۔ وحدت کا شہود اس کی آنکھوں کے سامنے اس قدر نمایاں ہے۔ اور اس کے دل میں اس طرح قائم اور جاگزین ہے۔ کہ وہ کہیں نہیں رک سکتا۔ اس کی نظروں میں۔

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے

یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انساں کے لہو کا

یہ تصوف کی ابتدائی منازل ہیں جن میں فلسفہ کو ایسا دخل نہیں حکمت کی بھول بھلیاں کم نظر آتی ہیں۔ شاعر کی آنکھوں کے سامنے محفلِ قدرت کا دریائے بے پایاں حسن۔ آسمان اور زمین۔ کہسار اور دریا۔ ویرانے میں آبادی ہیں۔ موج زن ہے۔ اور شاعر اس کی لہروں کی طرب اندوزی میں سرشار ہے۔ مگر حکمت نے روح کی بے تابی کا سماں دکھا کر بے لطفی پیدا کر دی ہے۔ حسن کے اس عام جلوہ میں روح ماہیِ بے آب کی طرح بے قرار ہے۔ اور اس کی بے قراری بتا رہی ہے۔ [illegible] کسی گم گشتہ شے کی ہوس ہے۔ شاعر بھی روح کی اس بے قراری سے [illegible] ہو رہا ہے۔ اور حکمت کی اس گتھی کے سلجھانے سے عاجز۔ اور اپنی اس عاجزی کا معترف بھی ہے۔

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے آتا ہے کہاں سے

ولایت پہنچ کر اقبال کا تصوف حکمت کی آمیزش سے گوناگوں رنگ لایا۔ اب اس نے محبت کی آفرینش کا راز معلوم کر لیا۔ اس نے نظمِ ہستی کی ابتدا مشاہدہ کی۔ اور وہاں محبت کے اجزا اور ان کی ترکیب دیکھی۔ اور پھر محبت کی کشش اور محبت کے اثر سے پہنائے عالم میں زندگی کے مذاق کی تڑپ آفتابوں اور ستاروں کے خرامِ ناز سے لیکر غنچوں کی چٹک اور لالہ زاروں کے داغ میں کارفرما پائی۔ اس نے دل کی آنکھوں سے دیکھ لیا اور تاڑ لیا کہ

ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

اقبال کی شاعری میں محبت کی جلوہ آرائیوں کا تذکرہ ہم نے مناسب مواقع پر کر دیا ہے۔ اور یہاں اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

صوفیانہ مذاق نے اقبال سے ایک مناجات لکھوائی ہے۔ اس پر ہم کچھ نہیں لکھ سکتے۔ مناجات پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس میں جو مزا ہے۔ وہ اسلامی دل کا ہی حصہ ہے۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ مری حدیث گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

تصوف نے حضرت انسان کو عالم اکبر مانا ہے۔ اور اقبال نے مقصد شاعری کی تکمیل کی اغراض میں اس مسئلہ پر زور دیا ہے۔ اقبال نے محبت کے عام کرنے

ہیں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ خدا کے عاشقوں کا طلبگار نہیں۔ وہ جانتا ہے۔ کہ ایسے ہزاروں بتوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ خدا کے بندوں سے پیار کرنے والے کا طالب ہے۔ اور ایسے مل جائیں تو ان کا مرہم۔ اس نے غور کیا ہے اس نے تجربہ سے بھی مشاہدہ کیا ہے کہ اس رسم کو عام کرنے کے لئے ایک مرکز کی ضرورت اور مرکزی جمعیت لازمی ہے۔ اس نے اصول اسلامی میں وہ مرکز دیکھا ہے۔ اور اسلامیوں میں اپنی مطلوب جمعیت کے خواص بتائے ہیں۔ لیکن مسلمان۔ اقبال دیکھتا ہے۔ جمود و سکون کا شیدائی ہو رہا ہے۔ اور بے مقدوری کے احساس سے ناکارہ۔ اقبال نے تصوف کے رنگ میں اس کے بے مقدوری کے خیال کو بدل کر خودی اور خود افزائی کے ممکنات زندگی سے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح اسے جمود و سکون کے تباہ کن اثرات سے آزاد کر کے اسلام اور اس کے ذریعے عامۃ الناس کی محبت اور خدمت میں عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرنا چاہا ہے۔ بار بار مختلف پیرایوں میں مختلف صورتوں میں اس کے ذہن نشین کرانے کی سعی کی گئی ہے۔ اسے بتایا گیا ہے۔ کہ اسے اپنی حقیقت سے آشنا ہونا چاہئے۔ اسے سمجھنا چاہئے۔ اس کی اصلیت کیا ہے۔ وضاحت سے اس پر ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ ضروریات زندگی میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔ لوازمات عیش و عشرت میں بھی اسے غیر کی پرواہ نہیں۔ اور ناز و نیاز کا حظ اٹھانے کے لئے خود محبوب اس کی ذات میں موجود ہے۔ جادۂ حیات میں اسے کوئی رہنمائی یا رہنما درکار نہیں۔ بحر زندگانی میں خطرات طوفان اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اسے یہ بھی جتا دیا گیا ہے۔ کہ اگرچہ بظاہر وہ ایک قطرہ ہے۔ لیکن بمثال بحر بے پایاں بھی ہے۔ اور اس میں

شوکت طوفان بھی پوشیدہ ہے اور۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیر و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اور یہ سامان۔ یہ طاقت یونہی نہیں۔ خدائی ہاتھ کی تائید۔ پیمانِ ایزدی۔ اس کے کفیل ہیں۔ اسی سلسلہ میں خلافت الٰہیہ کے اصول کو کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

اور

تیری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

اس ضمن میں خودی اور خود افزائی کی تلقین ہے۔ جو اپنی جگہ پر مفصل بیان کر دی گئی ہے۔

قارئین سے مخفی نہیں۔ کہ اقبال کی شاعری تصوّف اور حکمت۔ صوفیانہ انداز۔ اور فلسفیانہ رنگ سے مزین ہے۔ اور شاعری میں تصوّف اور فلسفہ اس قدر ملے جلے ہیں۔ کہ ان میں حد فاصل قائم کرنا آسان نہیں۔ اس لیے ہم نے تصوّف اور فلسفہ کی ذیل میں بعض امور ایک عنوان کے نیچے اور بعض دوسرے عنوان کے نیچے درج کر دیئے ہیں۔ ناظرین خود اپنے اپنے خیالات اور مذاق کے مطابق حظ اٹھا سکیں گے۔

یہاں ہمیں اب صرف مسئلہ فنا کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اس کا مفصل

ذکر فلسفہ کی تحت میں کیا جاویگا۔ اقبال نے اس مسئلہ پر اس خوبی اور لطافت سے طبع آزمائی کی ہے۔ کہ تحسین و آفرین سو زبان سے مداح ہے۔ اس موقعہ پر ہم صرف دو مثالیں اس ضمن میں پیش کریں گے اور بس۔ آپ ملاحظہ کرینگے کہ اقبال نے والدہ مرحومہ کی یاد میں ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں موت پر سخن طرازیاں ہیں۔ اور پسماندگان موتیٰ کے اطمینان قلب کے لئے تصوف اور حکمت کی تسلیاں۔ اقبال فرماتے ہیں۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اور اس مسئلہ کی تائید میں دلیل پیش کی گئی ہے۔ جو ناظرین کی توجہ کے قابل ہے۔ پھول پژمردہ ہو جاتا ہے۔ فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا فنا ہو جانا اسے نیست نہیں کر دیتا۔ اسے نابود نہیں کرتا۔ اس کا بیج رہتا ہے۔ اور مدفون بیج زندگی کے شوق سے جو اس کے سینہ میں ہے ابھرتا ہے۔ اور از سر نو اسی اپنی پہلی آب و تاب سے پھلتا پھولتا ہے۔ مٹی جس میں وہ دبا یا گیا تھا۔ اسے افسردہ نہیں کرتی۔ اس کے نشو و نما میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی۔ شاعر کا طرز بیان ملاحظہ طلب ہے۔

تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی۔ خود فزائی کے لئے مجبور ہے
سرد ہی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

دوسری مثال بھی اسی نظم میں ملیگی۔ یہاں اصول قائم کیا ہے۔ کہ قدرت کو زندگی پیاری ہے۔ اور اس قدر پیاری ہے۔ کہ ہر چیز کی فطرت میں ذوق حفظ زندگی ودیعت کر دیا گیا ہے۔ موت کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ اگر موت کے ہاتھوں نقش حیات مٹانا ہوتا تو نظام کائنات موت کو یوں عام نہ کر دیتا۔ اس کا عام ہونا بتا رہا ہے۔ کہ اجل کچھ بھی نہیں۔

جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

اب دلیل ملاحظہ ہو۔

جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

کیا ہی انداز ہے۔

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر

فلسفہ — اقبال کی نظمیں چھوٹی بڑی فلسفی خیالات سے مزین اور مملو ہیں۔ بلکہ اس کا ایک ایک شعر کسی نہ کسی فلسفی نکتہ کا حاصل ہے۔ زندگی کی منازل بالخصوص اس کی حکیمانہ جستجو کی جولان گاہ رہی ہیں۔ اوران کے

مختلف مدارج پر اقبال کے ساحری فن تخیل نے فلسفہ کے ادق اور اہم مسائل کو صوفیانہ رنگ اور ادا سے بے انتہا لطیف پیرایوں میں جلوہ آرا کر دیا ہے انسان کہاں سے آیا۔ اس کی پیدائش کے کیا معنی ہیں۔ یہ دنیا کیا ہے۔ اور یہاں انسان کی زندگی کی کیا حقیقت ہے۔ موت کیا ہے۔ اور اس میں کیا اسرار مضمر ہیں۔ اور بعد از موت کیا ہوگا۔ چند سوالات ہیں۔ جو ہمارے فلسفی شاعر نے اپنے انداز میں بیان کئے ہیں۔ طرز بیان کی دلفریبی پر ہم کچھ نہیں لکھتے۔ اہل مذاق خود دیکھ سکتے ہیں۔

انسان کہاں سے آیا۔ اور اس کی پیدائش کے کیا معنی ہیں۔ شاعرانہ تخیل کی شمع کی روشنی میں یوں منکشف ہوتے ہیں۔

صبح ازل جو حسن ہوا دلستان عشق
آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ

اور نتیجہ کیا ہوا۔

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا

اور اب ۔

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یاد وطن فسردگی بے سبب نہیں
شوق نظر کبھی کبھی ذوق طلب نہیں

بچہ اور شمع نے اس راز کی حقیقت اور بھی بے نقاب کردی۔ شمع کی لو بچّہ کی دلچسپی کا باعث ہو رہی ہے۔ یہ لو اس کے ہنسنے سے دل کو بے قرار کئے دیتی ہے۔ بچہ مدّت کے بچھڑے ہوؤں کے ذوق بغلگیری سے شعلہ کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ ایسی کوئی دیر کی دیکھی ہوئی چیز نظر آتی ہے۔ پہچانتا ہے۔ اور پرانے تعلقات کے جذبات سے کھچا جا رہا ہے۔

بچہ کی اس وارفتگی سے عیاں ہے۔ کہ اس کے اندر نور ازل کی جھلک روح انسانی کے پردوں میں اپنے کرشمے دکھا رہی ہے۔ جھلک جو شعلہ شمع کی طرح عریاں نہیں۔ بلکہ خاک تیرہ (جسم) کے فانوس میں پنہاں کردی گئی ہے۔ خدا جانے کیوں۔ مگر نتیجہ اس ستر خاکی کا ظاہر ہے۔ شروع شروع میں روح اپنے منبع سے دور۔ نور کی چمک کو۔ خواہ وہ کسی رنگ یا لباس میں ہو۔ ہمزاد جو پاتی ہے کشش مجانست سے بے تاب ہو کر اس کی طرف دوڑتی ہے۔ بچپن کا زمانہ گذرا۔ وقت نے جدائی کے افتراق کو بڑھا دیا۔ اور وہی بچہ جوں جوں زندگی کی پیچ در پیچ وادیوں میں اترتا گیا۔ اپنی اصلیت کو بھول گیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس زندگی کا احساس۔ اس زندگی کا ہوش روح کو حیات ماسبق بھلا دیتا ہے۔

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، مستی ہے، بیہوشی ہے یہ

لیکن اس فراموشی میں بھی۔ حیات ماسبق کی خواب کی سی یاد روح کو حیران و پریشان

رکھتی ہے۔ روح دیکھتی ہے کہ محفل قدرت حسن سے مالامال ہے۔

چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

مگر اس دریائے بے پایان حسن میں بھی اسے قرار نہیں۔

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ تاب ہے
زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے

صاف ظاہر ہے۔ کہ اس کی بے تابی بلا وجہ نہیں۔ اسے کسی گم گشتہ شئے کی ہوس پریشان کر رہی ہے۔ اور اُسی کی یاد میں۔ اسی کی جدائی میں یہ بے قرار ہے۔ شمع کی لو میں پتنگے کی شیفتگی جو ہم دیکھتے ہیں۔ وہ لو کی ضو میں شاعر کے دل کی تڑپ میں جلوہ گر ہے۔ شاعر خود بتا رہا ہے۔

نور کا جویا ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں

یہ شیفتگی۔ یہ بے قراری۔ یہ بے تابی۔ اور یہ تڑپ روح کو اپنے منبع اپنے مبدا میں شامل ہونے کے لئے ہے۔ مولانا شبلی کے الفاظ میں حضرات صوفیا کے نزدیک روح ازلی اور ابدی چیز ہے لیکن وہ ایک جوہر واحد بسیط ہے۔ افراد انسانی میں اس کا تعدد اس طرح ہے جس طرح آفتاب کا نور ہے۔ جو تمام عالم میں چھایا ہوا ہے۔ مگر جن چیزوں پر منعکس ہوتا ہے ان کے اختلاف حالت سے اس کی کیفیت اور صورت بدل جاتی ہے۔ ہم نور ازل کے پرتو ہیں۔ اور ہماری روح جو حیات انسانی کے دوران میں بے قرار رہتی ہے۔ اس زندگی کے بعد روح کل میں ملنے کی متمنی رہتی ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے۔ تو اس کی روح۔ روح کل میں جاکر

مل جاتی ہے۔

یہ تھی زندگی کی ابتدا۔ اور اب موجودہ زندگی۔ اس دنیا کی زندگی کی حقیقت۔ زندگی جس میں ہم منہمک ہو کر دن رات حیران و پریشان پھر رہے ہیں فلسفیانہ انداز میں یوں بیان کی گئی ہے۔

عالم ظہور جلوہ ذوق شعور ہے

غور سے دیکھا جائے۔ تو زندگی سعی پیہم میں ہے۔ اور سعی پیہم ہی کم و کیف حیات کا راز ہے۔ شمار سحر و شام۔ یا پیمانۂ امروز و فردا سے زندگی کا اندازہ کرنا صحیح نہیں۔

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

تگا پوئے دمادم زندگی کی دلیل ہے۔ اور گردش پیہم میں زندگی کے دوام کا راز ہے۔ زندگی کا قیام و دوام سعی سے ہی وابستہ ہے۔ اور راز حیات حضرت خضرؑ سے ہی پوچھا جائے تو یہی بتائیں گے۔ کہ

زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

کوشش ناتمام سے وہ کوشش مراد ہے۔ جو منتہائے مقصد کے حصول میں ہر دم ساعی ہو۔ کبھی تھکے نہیں کہیں رکے نہیں۔ یہاں ٹھہرنا منع ہے۔ رُک جانا گناہ۔ ٹھہرے تو مارے گئے۔ رُکے تو کچلے گئے۔ پس گئے۔ یہی قانون قدرت ہے۔ یہی سنت اللہ ہے۔ اور جو لوگ قانون قدرت کے ماتحت نہیں چلتے۔ سنت اللہ کی متابعت میں کوتاہیاں کرتے ہیں۔ ان کا انجام معلوم۔

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چاند اور تارے یہی راگ گاتے ہیں۔ اور جوئے سرود آفرین بھی دل کش نغموں میں یہی سنا رہی ہے۔

زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار ہے

حکمت کی نکتہ آفرینیوں نے قدرت کے کارخانہ میں مشکل کشی اور جفا طلبی کشاکش نرم و گرما۔ تپ و تراش و خراش پست و شکست۔ فشار و سوز و کشید سلسلۂ ارتقا میں کارفرما پایا ہے۔ اور دیکھا ہے۔ کہ

اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام

یہی ہے راز تب و تاب ملّتِ عربی

حضرت خضر نے ظلمات میں آب حیات کا چشمہ پایا ہے۔ اور بقائے دوام کے مزے چکھے ہیں۔ زندگی کی اصلیّت۔ اور کیفیتوں پر ان سے زیادہ کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے۔ کہ خضر راہ نے زندگی کی تنگ تاریک منازل میں روشنی کی مناریں قائم کر دی ہیں۔ اور راہروؤں کے لئے نشانات لگا دئے ہیں۔ جو آنکھیں کھول کر چلنے والوں کو ادھر اُدھر بھٹکنے سے محفوظ رکھنے کے ذمہ وار ہو رہے ہیں۔ اور سیدھی راہ پر لے جا کر حیات ابدی کے کفیل نظر آتے ہیں۔

ہمیں بتایا گیا ہے۔ کہ زندگی سود و زیاں کے اندیشہ سے بالاتر ہے۔ جان کا جسم میں ہونا یا نہ ہونا زندگی کی دلیل نہیں۔ کبھی جان محفوظ رکھنے اور کبھی جان دیدینے میں بھی۔ زندگی ہے۔ زندگی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اور کشاکش اور سعی پیہم سے ملتی ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اشعار کیا ہیں حکمت کے موتی شعریت کی نازک لطیف لڑیوں میں پروئے ہیں۔ ان کا مزا بار بار پڑھنے میں ہے۔ پڑھئے اور غور کیجیے۔ ایک ایک شعر پڑھنے والے کو نہال کئے دیتا ہے۔ اور حکمت کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال۔

اسی سلسلہ میں ایک اور راز منکشف ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے۔ کہ زندگی تسلسل فرائض کا نام ہے۔ اس کے ہزاروں مراحل ہیں۔ اس کی سینکڑوں جلوہ گاہیں ہیں۔ اور ہر مرحلہ پر۔ منزل ہستی کی رسم و راہ الگ الگ ہے۔ اور۔

آخرت بھی زندگی کی ایک جولاں گاہ ہے

ملاحظہ کیجیے۔ یہاں موت کی حقیقت ظاہر ہو رہی ہے۔ اور اس حقیقت پر شاعر نے وہ ضیا پاشیاں کی ہیں۔ کہ حیات و ممات کا مسئلہ دل لبھانے والے مناظر پیش کرتا ہے۔

ہمیں بتایا گیا ہے۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

مذاق زندگی کی تجدید کا نام موت ہے۔ موت اختتام زندگی نہیں۔

ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

انسان فنا نہیں ہوتا۔ حیات انسانی محض صورت بدلتی ہے۔ یہی آئین ہستی

ہے۔ یہی تقاضاء فطرت ہے۔

البتہ اس مرحلہ پر فلسفی شاعر کا دل مضطرب ہے۔ وہ سوچتا ہے۔

فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اُس کو جستجو رہتی نہ ہو

اس عقدہ کا حل سہل نہیں۔ اسے یہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر شاعر کو اطمینان ہے۔ کہ

نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں

اور موجودہ حیات کے اختتام پر آخرت کی زندگی ہے۔

اور۔

ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
ساز گار آب و ہوا تخم اجل کے واسطے

دیکھیے تصوف کے رنگ نے اسی مسئلہ کو کس آب و تاب سے ظاہر کیا ہے۔

مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا
یہ شرارہ بجھ کے آتش خانہ آذر بنا
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

تخیل فلسفی نے زندگی کی دو تصویریں زیب قرطاس کی ہیں۔ اور دو نو نقش آب رواں کے ہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی۔ بولتی چلتی تصویریں ہیں۔ جو دیکھنے والے کو متحیر کر رہی ہیں۔ اور ان کی موسیقیت میں سرور و انبساط کی لہریں ہیں جو سننے والے کو مدہوش کئے دیتی ہیں۔

• ایک تصویر تو میدان میں دریا کے کنارے لی گئی ہے۔ اور سبزہ دریا

پریشانیوں کی تگاپو نے اس کی خط کشی کی ہے۔ زندگی کی رواروی کی رنگ آمیزیاں ہیں۔ اور موت کی نظر فریب وسنگ کاریاں۔

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہُوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز
سبک روی میں مثال نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقہ حد نگہ سے دور گئی
جہاز زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

دوسرا نقش پہاڑ سے ندی کا نکلنا دکھا رہا ہے۔ اور زندگی کے مختلف مراحل نشیب و فراز کی ایک دلکش تصویر ہے۔

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
طائران آسماں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجران قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے

دو قدم پر پھر وہی جو مثل تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی
پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

دریا کا کنارہ تصویر کا ایک رخ ہی دکھاتا ہے۔ لیکن ندی تصویر کے دونو رُخ صاف اور شفاف رنگوں میں ظاہر کر رہی ہے۔ حیاتِ انسانی کی ابتدا۔ روحِ انسان کا ملاءِ اعلیٰ میں روحِ ازل سے وابستہ ہونا۔ فرازِ کوہ سے نشیب میں اُترنے سے افتراق کے نظارے۔ اور پھر راہروی میں اصلیّت کی طرف رجوع۔ ندی کی روانی میں چشمِ بینش دیکھ رہی ہے۔

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

"فلسفۂ غم" میں زندگی کی کیفیتِ غم کو بھی رازِ زندگی بتایا ہے۔ اور حادثاتِ غم سے ہے انسان کی فطرت کو کمال، بیان کیا ہے۔

حکمت کی ضوء گستری نے موت کے ایک اور پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے دنیا کا دستور ہے۔ فطرت کا اصول ہے۔ اس کا تقاضا ہے۔ ایک کے اوج میں دوسرے کی پستی۔ ایک کے نقصان میں دوسرے کا فائدہ اور ایک کی ہستی میں دوسرے کی فنا مضمر ہے۔ ہمارے فلسفی شاعر نے اس اصولِ فطرت کی دو تمثیلیں جادو کی زبان میں بیان کی ہیں۔ پہلی تمثیل۔ آفتاب اور ستاروں سے لی ہے۔ طرزِ بیان ملاحظہ طلب ہے۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند ہے زندگی کی مستی ہے

کون انکار کرسکتا ہے۔ کہ آفتاب کا پیدا ہونا ستاروں کے لیئے پیغام اجل ہے دن چڑھا۔ اور ستارے غائب۔ ستارے فنا کی نیند میں آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ اور ان کی شب افروز ٹمٹماہٹ مدہم اور بالآخر ناپید ہوجاتی ہے۔ اور اس ٹمٹماہٹ کی پھیکی روشنی کی جگہ سورج نور کی لہریں پہنا ئے عالم میں پھیلا دیتا ہے۔ اور دنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک دن چڑھا دیتا ہے۔ اسی خیال کو ایک اور دلفریب انداز میں بھی ظاہر کیا گیا ہے

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس مسئلہ کے بیان کرنے میں شاعر کا کچھ اور مطلب بھی ہے اُس نے فطرت کی اس عادت کی طرف ہماری توجہ دلا کر یہ حقیقت منکشف کی ہے۔ کہ نقصان میں فائدے اور مصائب میں ترقی کے مراتب ہیں۔ وہ ہمیں مایوسیوں کی پستی سے نکال کر امید کی بلندیوں پر پہنچانا چاہتا ہے۔ اور قانون قدرت کے وعدوں سے ہماری ہمت بڑھا کر ہمیں ترقی کی شاہراہ پر چلانے کا متقاضی ہے۔

دوسری تمثیل بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور حسن ادا میں ویسی ہی دلربا۔

وداع غنچہ میں ہے راز آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے

صاف ظاہر ہے۔ کہ غنچہ کی زندگی کا خاتمہ پھول کی حیات کا آغاز ہے جب تک غنچہ غنچہ ہے۔ پھول نہیں ہوسکتا۔ پھول ہونے کے لئے غنچہ کی معدومیّت لازمی ہے۔ جب پھول نمودار ہُوا۔ غنچہ نابود۔ راز زندگی

عیاں ہے۔

فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

ولادت مہر۔ اور وداع غنچہ کی تمثیلوں سے شاعر نے بے ثباتی زمانہ بھی دکھائی ہے۔ جیسا کہ وہ خود ان تمثیلوں کے ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس کے ساتھ ہی۔

"آئین جہاں کا ہے جدائی"

ظاہر کیا ہے۔ اور تاروں کی گردش کا اصول بنا کر "ثبات آشنائی" کو خواب سے تعبیر کیا ہے۔

کہیں کہیں فلسفہ نے رموز زندگی سے بھی ہمیں آشنا کرا دیا ہے۔
دنیا میں رہنے کے لئے۔ اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے۔ ماحول کا لحاظ ضروری ہے۔ ماحول کے تقاضے مدنظر رکھنے لازمی ہیں۔ اور ضروریات کے مطابق۔ اپنا رویہ۔ اپنی چال بنانا لابدی۔ اور اسی میں فرزانگی ہے۔

اے رہرو فرزانہ رستے میں اگر تیرے
گلشن ہے تو شبنم ہو صحرا ہے تو طوفاں ہو

اور اسی اصول کی مطابعت میں۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے

گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اگر یہ اصول زندگی نظر انداز کر دیا جائے۔ تو دقتیں پیش آئینگی۔ نقصانات ہونگے۔ جن کا حل مشکل ہو گا۔ جن کی تلافی ناممکن ہو گی۔ حقیقت تو یہ ہے اور اسی میں بچاؤ ہے۔ کہ

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ باردوش ہے

قالب انسان میں جان کا ہونا ضروری ہے۔ جان جس میں خودی کی چمک اور خود افزائی کی تڑپ ہو۔ فقر و غنا کا انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں۔ اس کی ترقی۔ اس کی قوت کا راز۔ اس کے اپنے دل میں۔ اس کے اپنے حسیات میں ہے۔

نری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

وطنیت ۱۲ اقبال وطنیت کا علم بردار نہیں۔ اس کے نزدیک وطنیت منافی تلقین مذہب اسلام ہے۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اس کا عقیدہ ہے۔ کہ وطنیت تہذیب نو کا تراشا ہوا بت ہے۔ اور اس

کے ذریعہ تجارت کو تسخیر کرنا مقصود ہے۔ اور دیکھا جائے تو

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اخوت مذہب اسلام کا ایک زریں اور مبارک اصول ہے۔ اور وطنیت اسی اصول کی تلقین کے متضاد ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کے درمیان بلا تمیز مقامی۔ بلا امتیاز نسل و رنگ۔ اخوت کا سلسلہ قائم کرتا ہے۔ اور کلمۃ اللہ کی مضبوط کڑیاں مشرق سے لیکر مغرب تک۔ اور شمال سے جنوب تک اس سلسلہ کے قیام و دوام کی ذمہ داری لئے ہوئے ہیں۔ اتحاد وطن اس سلسلہ میں شرط نہیں۔ نسل و رنگ کے افتراق کی یہاں پرواہ نہیں۔ قومیت اسلام کا دامان گرد وطن سے پاک ہے۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اور اسی بنا پر شاعر کی تلقین ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اور اس اصول کو نظر انداز کرنے کے خطرات سے بھی متنبہ کر دیا ہے

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں

اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اور پھر نتیجہ معلوم۔

آبرو باقی تری ملّت کی جمعیّت سے تھی
جب یہ جمعیّت گئی دنیا میں رسوا تو ہُوا

عجمیت[11] ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اقبال عجمیّت کے خلاف ہے۔ وہ مسلمانوں کی بہبودی ان کے قیام و دوام کا راز۔ حجازی آئین اور خالص اسلامی روایات و شعائر میں دیکھتا ہے۔ وہ تو اپنی نغمہ سرائیوں میں بھی عربی نوا کا دلدادہ ہے۔ اور اس پر نازاں بھی ہے۔

مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

وہ اپنی اس نوا سے دلوں میں درد پیدا کرنا چاہتا ہے اور سوتوں کو جگانے کا خواہاں ہے۔ اس کی تمنّا ہے۔ کہ اسلامی جو عہدِ وفا بھول گئے ہیں۔ پھر تازہ کریں۔ اور ان کے دل و جگر حجازی تہذیب کی پرانی شراب کے پیاسے نظر آنے لگیں۔ اسے اپنے نغموں پر بھروسا ہے۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ ان کے ذریعے اس کی تمنّا بر آئیگی۔ اسے وثوق ہے۔

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اقبال عجمی انداز سے بے حد بیزار ہے۔ اور مسلمان کی خاک کے ذرّہ ذرّہ کو تعمیر حرم میں لگا دینا چاہتا ہے۔ اس کی بیزاری کی وجوہات ہیں۔ وجوہات جو فدایان قوم نے ہاتف کی زبان سے اس پر ظاہر کی ہیں۔ اور جو اس کے اپنے تجربہ پر مبنی ہیں۔ اسے بتایا گیا ہے۔ کہ نئی تعلیم سے دنیا تو ملی یا نہ ملی لیکن دین رخصت ہو گیا ہے۔ اور وہ حضور رسالت میں شکایت کرکے اپنے دل کا بخار نکالتا ہے۔

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امّت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اس نے دیکھا ہے۔ اور حسرت و اندوہ سے دیکھا ہے۔ کہ پیر حرم کی کم نگاہی حرم کی رسوائی کا باعث ہوئی ہے۔ اور خود اہل حرم کی وفا ناآشنا کاریوں نے حصار ملت میں وہ رخنے پیدا کر دیئے ہیں۔ کہ

کسی تنگدرے میں بیاں کروں۔ تو کہے صنم بھی ہری ہری۔

اُس نے دیکھا ہے اور غم و غصّہ سے دیکھا ہے۔ کہ

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

وہ جانتا ہے۔

ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک
نوجواں اقوام نودولت کے ہیں پیرایہ پوش

یوروپ میں تہذیب حاضر کے مزار پر اس نے خون کے آنسوؤں کے ہار چڑھائے ہیں۔ اور ہند میں یہاں کے بت گری پیشہ مسلمانوں سے پناہ مانگ کر حجاز کی خاک راہ بننے کے لئے دعا کے ہاتھ اٹھائے ہیں۔

اس کی شاعری کا مقصد مسلمانوں کو حجازی تہذیب۔ حجازی تعلیم و تلقین کا مفتون بنانا ہے۔ وہ ان کی فلاح۔ ان کی ترقی اسی میں دیکھتا ہے۔ وہ انہیں بار بار کہتا ہے۔ مختلف پیرایوں میں سمجھاتا ہے۔

غافل اپنے آشیاں کو آکے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طور معنے پر کلیم نکتہ بیں
سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن

شعلہ ساں از ہر کجا بر خاستی آنجا نشین

وہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کے ہم مشرب ابھی بادہ عجم کے خمار میں ہیں۔ اور اس کے پیمانے سے جو شراب عربی سے لبریز ہے جھجکتے ہیں۔ مے آشام نشہ کے لئے یوں تو مر رہے ہیں۔ لیکن پیر مغاں عجم کے ایسے دلدادہ ہو رہے ہیں۔ کہ عرب کے نام سے بھی بھڑکتے ہیں۔ انہوں نے فرنگستان کی مے میں نشاط کے مزے لئے ہیں۔ اور نادان نہیں جانتے۔ کہ اس کے اثرات کیا ہیں۔ اور کیا ہو رہے ہیں۔ کاش وہ جانیں۔ کہ

خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بے ہوش ہے

اس پر بھی اقبال مایوس نہیں۔ خدا خدا کر کے اس کی نگاہ نکتہ بیں نے امید کے دل افزا جلوے مشاہدہ کئے ہیں۔ اور اب اس کی آنکھیں روشن اور دل شاد ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے۔ کہ

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز

اس نظارہ سے اس کے نغموں میں کیف سرور۔ اور اس کی نوا پیرائیوں میں کیفیت وجد نمایاں ہے۔ وہ سرشار ہے۔ اور اپنی حجازی لے میں کس لطف سے کہہ رہا ہے۔ اور دیکھئے کیا خوب کہہ رہا ہے۔

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز

بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی

پھر دکاں تیری ہے لبریز صدائے نائو نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند

پھر سلیمے کی نظر دیتی ہے پیغام خروش

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

پان اسلام ازم یا اتحاد سیاسیہ ملیہ

کہا گیا ہے۔ کہ اقبال اتحاد سیاسیہ ملیہ کا علمبردار ہے۔ وہ مسلمانان عالم کی تنظیم سے اُن کا سیاسی اقتدار تختۂ دنیا پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اقبال کا کلام اگر بغور پڑھا جائے۔ ہمیں بتا دیگا کہ اسلامیوں کا سیاسی تسلّط اس کی شاعری کا مقصد ہرگز نہیں۔ اس کا مدعا۔ اس کی نغمہ سرائیوں کا موضوع سیاسیات کی چالبازیوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ سیاسیات ہیں۔ اقتصادیات ہیں۔ دنیا کی مادی ترقی ہیں۔ نئی تہذیب کے آرام و آسائش ہیں۔ اس کی شوکت وسطوت ہیں۔ اس کے تجمل و شان میں ارتقاء انسانی نہیں دیکھتا۔ وہ تو عالم موجودات میں حضرت انسان کی عظمت و وقار کے جلوے۔ عظمت و وقار جو خلافت الٰہی کے شایانِ شان ہے۔ دیکھنے کا خواہاں اور متمنی ہے۔

قرآنی تعلیم کے رو سے انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ اور اس کا فرض یہاں عالم سفلی کی پابندیوں میں۔ دنیا و دل کے علائق کی دل بستگیوں میں۔ انوار الٰہی۔ اور فیوض ربانی کی برکتوں سے عالم علوی کی پاکیزہ زندگی کی تجلیات سے پہنائے عالم کو آباد اور منوّر کر دینا ہے۔ خلافت الٰہیہ ارتقاء انسانی کا نصب العین ہے۔ اور پاکیزگی روح۔ تزکیہ نفس ہی انسان کو اس معراج ترقی پر پہنچا سکتے ہیں۔ اور اس کی ہستی کے راز کی عقدہ کشائی کرسکتے ہیں۔

اقبال نے انسان کے ارتقاء روحانی کا نسخہ تلقین اسلام میں دیکھا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام ایک عظیم الشان اور بے عدیل نظام

ہے جس کی ترکیب و ترتیب میں اعلائے کلمۃ اللہ کی قیادت سے زبردست عالمگیر تحریکیں حضرت انسان کی روحانی طاقتوں کا سکہ مشرق و مغرب میں جما رہی ہیں۔

اقبال نے دیکھا ہے۔ کہ انسان جو قدرت کی سطوت سے مرعوب ہو کر۔ اس کے مقابلہ میں اپنی بے مقدوری کے احساس میں۔ قدرت کی قوتوں کا پجاری بن رہا تھا۔ اور کہیں چاند۔ کہیں تارے کہیں سورج۔ کہیں پتھر۔ اور کہیں شجر معبود بنائے بیٹھا تھا۔ اسلامی تعلیم سے ان توہمات اور باطل پرستیوں سے آزاد ہو گیا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ اور مظاہرات قدرت جو پہلے پرستش کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اب کلام ربانی کے زور سے مسلم کو انسان کی خدمت گذاری میں شب و روز مامور نظر آتے ہیں۔ بلکہ اس کا تو ایمان ہے کہ انہیں مظاہرات قدرت کو۔ اللہ جل شانہ نے اپنے خلیفہ۔ دنیا میں اپنے نائب مناب۔ اسی حضرت انسان کے لئے۔ اس کے فائدہ۔ اور اس کی خدمات کے لئے مسخر کر دیا ہوا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند
تا کہ نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اب وہ ان سے گھبراتا نہیں۔ ڈرتا نہیں۔ اور کبھی جو انہیں اپنا آقا سمجھتا تھا۔ اب یقیناً تعلیم قرآنی کی دولت سے۔ اپنا فرمانبردار۔ اور باوفا فرمانبردار پاتا ہے۔

اقبال نے دیکھا ہے۔ کہ اسلام نے جمعیت ملی کے انتظام اور انضباط میں۔ نئے نئے آئین۔ نئے نئے قواعد۔ تبادلہ خیالات و تعلیم تعلم کے مدعا سے

مرتب کیے ہیں۔ اسلام کافۃ الناس۔ اولاد آدم ؑ۔ اتحاد و اخوت عالم کے دائرہ میں لانا چاہتا ہے یہاں نسل۔ رنگ۔ اور ملک کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس نے کل بنی آدم کو بادشاہ سے لیکر فقیر تک عرب سے لیکر افریقی تک۔ ترک سے لیکر زنگی تک اپنے آئین کے حلقہ میں برابری اور ہمسری کے رتبہ پر رکھا ہے۔ اسلام کے سامنے مدارج دنیاوی۔ مراتب نسلی کا کوئی اثر نہیں۔ اسلام انسان کو من حیث الانسان اعلیٰ علیین کے اوج پرور منازل پر پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ انسان کی مادی ترقی اقتصادی وسعت پر کو انسانی ترقی کا معیار نہیں سمجھتا۔ یہ انسان میں خلافت الٰہیہ کی شان کے مطابق۔ اس کے ملکوتی صفات۔ اس کے قدوسی امکانات کا نشوونما پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس نشوونما سے اس کی زندگی کا مدعا خدائی نیابت روحانی تسلط۔ کا جہان میں قائم کرنے کا خواہشمند ہے

اقبال نے یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ اسلام افراد میں۔ اور جمعیت میں بھی خودی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسے سکھایا ہے۔ کہ انسان کی ہستی بے حد قوتوں سے معمور ہے۔ اس میں ابدی ارتقا کا جوہر ہے۔ جو اپنے لازوال کرشموں سے زندگی جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ اس کی شخصیت کو مٹانے کے لیے بے شمار طاقتیں دن رات ساعی ہیں۔ لیکن کلام الٰہی اس کے ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ۔ اور دوسرے طبقہ سے تیسرے طبقہ تک۔ ایک لازوال سلسلہ میں۔ اس کے تدریجی ارتقا کی کفیل ہے۔

اس طرح اقبال نے انسانی ترقی۔ روحانی نشوونما۔ انسانی احسن تقویم کا خلافت الٰہیہ کی شان و شوکت میں کسی مادی آلودگی کے

بغیر۔ دنیا میں جلوہ افروز ہونے کا واحد ذریعہ اسلام ہی کو پایا ہے۔ اور دیکھا ہے۔ اس کا ایمان ہے۔ کہ رسول عربی کی تعلیم و تلقین نے انسان کو اس کی اصلی حیثیت میں منازل زندگی طے کرنے کے اصول بتلائے ہیں۔ وہ قائل ہے۔ وللہ درمن قال۔

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا۔

اور اسی وجہ سے وہ اسلام اور اسلامیوں کو مخاطب کر کے اس عرب ہاشمی کے سلسلہ تنظیم میں آدمی کا بول بالا دیکھ رہا ہے۔ اور بول بالا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس تنظیم اسلامی کی موسیقیت سے اپنے ترانوں میں جان ڈال کر دنیا اور دنیا والوں کو دکھانا چاہتا ہے۔ کہ اسلام کا مستقبل کس قدر جان پرور اور روح افزا ہے۔ اور یہی ایک راگ۔ یہی ایک رنگ ہے جو چمنستان عالم میں آدمی کا بول بالا کر سکتا ہے۔ اور کر رہا ہے۔

طرز بیان

طرزِ بیان

مولانا آزاد کے خیالات کو مدِ نظر رکھ کر جو مضامین کلام کے متعلق پچھلی سطور میں ہم لکھ آئے ہیں۔ تا حال ہم نے اقبال کی شاعری پر مضمون کے لحاظ سے تبصرہ کیا ہے۔ اور اب اس کے طرزِ بیان پر بھی کچھ تحریر کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) حسن و عشق کی زبان

ہم دیکھتے ہیں۔ کہ حالی اور اکبر جو اردو شاعری۔ قدیم شاعری۔ کے بت شکن کہے جا سکتے ہیں۔ بت اور ساتھ ہی اس کے بت کے ساز و سامان۔ اس کی حرکات و سکنات۔ اس کے اہالی موالی۔ اس کے متعلقات کے بھی مخالف ہیں۔ ہوس پرستی۔ اور ہوس پرستی کے جملہ لوازمات سے نفور ہیں۔ حسن کے ناز و انداز۔ عشق کے راز و نیاز۔ میں وہ کچھ لطف نہیں پاتے۔ اقبال ان کی طرح ہوس پرستی کے بت سے تو متنفر ضرور ہے۔ لیکن اس کی رواداری ماسوائے بت سے بیزار نہیں اس کی شاعری میں وہ بت۔ وہی پرانی ہوس پرستی کا بت مفقود ہے۔ مگر محبت کا وہ ٹھاٹھ۔ وہ ساز و سامان۔ وہی پرانی دلچسپی اور دلفریبی کے لوازمات موجود ہیں۔ حسن کی وہی شوخیاں ہیں عشق کی وہی گرمیاں ہیں۔ اقبال قدما کی رنگین بیانی کا شیدائی ہے۔ اور ان کی طرح گل و گلزار۔ رنگ و بو۔ ساقی و مینا۔ رقص و سرود۔ عشوہ و ناز کا فدائی۔ اس کے کلام میں حالی اور اکبر کی سادگی نہیں۔ اس کا اندازِ بیان قدیم حسن و عشق کی زبان میں ہے۔ اور اس کے لئے یہی اندازِ بیان ضروری بھی تھا۔

بوالہوس قوم سو سال سے ہوس بازی میں مشغول اور کئی سو سال سے عیش پرستی اور غفلت و سکون کی زندگی کی مفتون ہو رہی تھی۔ مذاق بگڑے ہوئے تھے۔ قوم کے مایہ ناز چشم فتاں کے مجروح۔ خم ابرو کے شہید۔ بے کار۔ نادار۔ مے پندار سے سرشار۔ غفلت کی شراب سے مخمور۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ اور زمانہ کی چال سے ناآشنا۔ بے اعتنائی کے سرور میں پڑے تھے۔ اور ان حالات میں شنوائی اور کام کی بات کی شنوائی مشکل نظر آتی تھی۔ فلسفی دماغ نے سامعین کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہیں حکم تاثیر دیکھا۔ قوم کو اس خواب غفلت سے جگانا ضروری تھا۔ ان کی ان سرمستیوں سے انہیں ہوش میں لانا لازمی تھا۔ تقاضائے وقت سے وہی پرانی مجلسیں گرما دیں۔ وہی راگ۔ وہی رنگ۔ وہی ساقی۔ وہی مینا۔ وہی شکوے اور وہی شکایتیں ہونے لگیں۔ سونے والے جو پہلے ہی سے حالی کے نالوں۔ اور اکبر کی چٹکیوں سے کچھ کچھ جاگ رہے تھے۔ اپنے پرانے مذاق کے موافق حسن و عشق کی سُریں سنکر اُٹھ بیٹھے ہیں۔ اور شاعر یقین کرتا ہے۔ کہ یہ لوگ زبان کی چاشنی سے لذت پاکر نئے مذاق کی حقیقت سے آپ ہی آشنا ہو جائیں گے۔ میدان سعی میں نکل آئیں گے۔ اسلام کی روایات کو سامنے رکھکر خلوص کے راستہ پر قدم بڑھائیں گے۔ اور نور توحید جہان میں پھیلا کر کفر و استبداد کی ظلمت کا پردہ اُٹھا دیں گے۔ اور محبت و اخوت کے نقش پہنائے عالم میں جما دیں گے۔ اقبال انہی قومی جذبات بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اور وہی ہوس بازی کی اصطلاحیں — وہی حسن و عشق کی زبان۔ وہی استعارے۔ وہی تشبیہیں۔ وہی رنگ۔ وہی راگ۔ وہی سُریں استعمال کرتا ہے۔

مسلمانوں کی بے بضاعتی کے تذکرے ہیں۔ اُن کی ناداری کی حکایتیں ہیں۔ ان کی خواری۔ ان کی رسوائی پر اشک افشانیاں ہیں۔ اور یہ سب کچھ کس ادا سے کس انداز سے عشق کی شیوہ بیانیوں کے لہجہ میں حسن کے راز و نیاز کے پردہ میں۔ بیان ہو رہا ہے۔

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

صرف جذبات ملّی کے اظہار میں ہی نہیں۔ بلکہ عاشق مزاج اسلامیوں کے دلوں میں ملّت کے مہتم بالشان جذبات پیدا کرنے کے لئے بھی اقبال بت پرستی کی سحر آفرین مصطلحات۔ اور عاشقی کے جادو اثر محاورات سے کام لیتا ہے اور کمال کرتا ہے۔

تھا جنہیں ذوق تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا! محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا
آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

کیا ہی انداز بیان ہے۔ قوم و ملت کی ویرانی جمعیت کی پریشانی و درد کے پہلو میں دکھائی ہیں۔ بظاہر تو شاعر کی بے ہنگام نغمہ سرائی پر اسے بتایا گیا ہے کہ اس کی نوا پیرائیاں بے سود ہیں۔ سننے والے ہی نہیں رہے۔ اس کی سخن پروری بے کار ہے۔ سمجھنے والے ہی رخصت ہو گئے۔ مگر حقیقت میں شاعر کو مخاطب کر کے قوم کے دل میں چٹکیاں لی ہیں۔ کہ کسی طرح ہوش میں آئے۔ اور جاگ اٹھے۔ اعلیٰ فلسفی خیالات بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ زندگی کی حقیقت۔ اس کا فلسفہ۔ اس کی جفاکشی۔ اس کی محنت شاقہ۔ اور اس کی شیرینی ادا اسی کے مزے کس خوبی سے کس لطافت سے عاشقوں کی جنون پرور داستان میں سنانا چاہتا ہے۔ اور دل باختگی کی سر دل میں سناتا ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

سیاسیات کے ادق مسائل بھی نئی نئی تشبیہات سے ذہن نشین کراتا ہے اور نئے نئے استعاروں سے سیاسی دلفریبیوں کے چہرہ سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اقبال ہمیں بتاتا ہے۔ کہ اقوام غالب کی اک جادوگری ہے۔ جو اپنی سحر طرازیوں سے محکوم کو مدہوش رکھتی ہے۔ تدبر کی فسوں کاری

کے نظر فریب نظارے محکوم کو مست الست کر دیتے ہیں۔ اور وہ ساحرانہ اثر میں حقیقت حال سے نا آشنا۔ خوش ہے کہ

عزیز رکھتا ہے اور کرتا خاطریں میری

ملا ہے خوبی قسمت سے مہرباں صیاد

اور نہیں سمجھتا کہ یہ خاطرداریاں جادوگر صیاد کے عملیات ہیں غلطی غلامی کی پابندیوں کا سلسلہ ہیں۔ اور اس سلسلہ کو پختہ اور مضبوط کرنے کی یہ ساحرانہ دستکاری۔ تدبر کی یہ فسوں کاری اقبال اپنے انداز میں یوں عیاں کرتے ہیں۔

جادو سے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز

دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

خیال بندی (۲) خیال بندی میں اقبال نے جدت طرازیاں کی ہیں۔ جو اسی کا حصہ ہیں۔

نیا شوالہ۔ ہندو مسلم اتحاد کی ایک نادر رنگ آمیزی ہے۔ اس میں خیال کی بلندی اور نقش کی شوخی بے انتہا دلکش ہیں۔

شمع و شاعر۔ شاعر اور شمع کے مطالعہ کی صورت میں ملی اور سیاسی مضمون بندی کا ایک بلند پایہ نمونہ ہے۔ شاعر کے استفسار پر شمع کی زبان سے ملی اور ملکی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قوم کے سیاسی تنزل۔ اور مذہبی اور اخلاقی انحطاط کے تذکرے ہیں۔ آئندہ کے لیے خودی خودداری جمعیت۔ اور عمل کی تلقین ہے۔ اور ایک روشن مستقبل کی پیشین گوئی سے اسلامیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

شکوہ اور جواب شکوہ۔ ایک اچھوتا انداز ہے۔ قوم کی گذشتہ عظمت

موجودہ لیستی - اور دل افزا مستقبل پر خدائے عزوجل نے بات چیت کر کے ایک لطیف کنایہ سے قوم کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

آفرینش محبت اور عشق و موت کے مرقعے عدیم المثال ہیں ۔ آئندہ اوراق میں ہم قارئین کرام کی توجہ ان مرقعوں کی طرف بالتفصیل دلائیں گے امید ہے ۔ کہ وہاں ان پر غور کرنے میں حظ وافر حاصل ہوگا ۔

اسی ذیل میں ہم دو چھوٹی چھوٹی نظمیں نقل کرتے ہیں ۔ ان میں مغربی خیالات کو مشرقی انداز اور رنگ میں دکھایا گیا ہے ۔ حقیقت میں حسن فرنگ مشہور ہندی عشوہ و ناز سے جلوہ گر ہے ۔ اور دیکھنے والوں کو اپنے ساحرانہ سامان دلبری سے محو حیرت کئے دیتا ہے ۔

ایک پرندہ اور جگنو

سرِ شام ایک مرغ نغمہ پیرا
کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر
اُڑا طائر اُسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغ نوا ریز
نہ کر بیکس پہ منقارِ ہوس تیز
تجھے جس نے چہک گل کو مہک دی
اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباس نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری بہشت گوش اگر ہے

چمک میری بھی فردوس نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی
تجھے اس نے صدائے دلربا دی
تری منقار کو گانا سکھایا
مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیام بزم ہستی ہے انہیں سے
ظہور اوج ہستی ہے انہیں سے
ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

خیال بندی کی صناعی ملاحظہ ہو۔ کیا ہی مرقع سجایا ہے۔ "ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی" سنانے اور سمجھانے کی بات تھی۔ "سوز و ساز" کے ارتباط کی ضرورت اور خوبیاں بتانی تھیں۔ شاعر کی طبع رسا نے "جگنو اور پرندہ" کی سیدھی سادی کہانی میں ایک دلچسپ اور سبق آموز مکالمہ سے زندگی کے اعلٰے اصول بیان کئے ہیں۔ اور اس رنگین انداز سے بیان کئے ہیں۔ کہ تعریف و توصیف کی زبان لال ہے۔

دوسری نظم "حقیقت حسن" پر ہے۔ حسن اور لطافت کی حکمت آموز سحر آفرینیاں قابل ملاحظہ ہیں۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے، حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

کیا ہی سوال ہے۔ اور کیا ہی جواب۔ حسن اور خدائے حسن کی باتیں ہیں۔ چاند اور تارے آسمانوں پر سنتے ہیں۔ شبنم راز کی بات زمین تک پہنچا دیتی ہے۔ سنتے ہی پھول آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ اور کلی کا ننھا سا دل غم سے خون ہو جاتا ہے۔

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اسی مظالم میں ایک اور نظم داد کی مستحق ہے۔ غور کیجئے۔ آپ دیکھینگے کہ طرابلس میں اطالوی مظالم نے اخوّت اسلامی کی رگوں میں ہمدردی کی لہریں دوڑائی ہیں۔ اور اس پر ایک اسلامی دل کے سوز نے چمنستان شاعری میں کیا ہی خوب گل کھلائے ہیں۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا — جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
قیود و شام و سحر میں بسر تو کی لیکن — نظام کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو — حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو
کہا حضور نے اے عندلیب باغ حجاز — کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا — فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز
اڑا جو پستیٔ دنیا سے تو سوئے گردوں — سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا — ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا
حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امّت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضورؐ کی سرکار میں اسلامیوں کی بیوفائیوں کی شکائتیں ہیں۔ شعائر اسلامی سے بے اعتنائی اور روایات اسلامیہ سے ناآشنائی کے شکوے ہیں۔

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

لیکن اقبال نے دیکھا ہے کہ کہیں کہیں کبھی کبھی۔ اس لیس بھری ہوا میں۔ اسی غیرت کی فضا میں بھی بوئے وفا کی جو نایاب ہو رہی ہے۔ روح پرور کرشمے دکھا دیتی ہے اور شاعر کا جادو رقم قلم ان کرشموں کے ایسے حیرت انگیز نقش بناتا ہے کہ تصویر میں جذبات عالیہ

کے رنگ دل و دماغ کو مسحور کر لیتے ہیں۔ مرقع میں آبگینہ کی نذر ایک طرف مردہ دل مسلمانوں کو تڑپا دینے والا اور ایک جاں فرسا منظر ہے۔ اور دوسری طرف یہ نظارہ کہ

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

غیرت اور حمیّت اسلامی کی رگوں میں زندگی کے آثار دکھا کر کافرآئین مسلم کو بھی وفا کیشی کی طرف کشاں کشاں لئے آ رہا ہے۔ اور طرابلس کے شہیدوں کا لہو مسلمانانِ عالم کو تخیل کے برقی اثرات سے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک تڑپا دیتا ہے۔

غالبیّت کہا گیا ہے کہ کلامِ اقبال میں غالبیّت کا عنصر غالب ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ فلسفہ اور صوفیانہ انداز نے کلام کو قدرتاً دقیق کر دیا ہے۔ اقبال کو خود بھی اس کا احساس ہے سنہ ۱۹۰۲ء میں دو نظمیں "شمع" اور "ایک آرزو" رسالہ مخزن میں شائع ہوئی تھیں اور اُس وقت مخزن کے فاضل اڈیٹر نے ان کے ساتھ اپنا ایک قیمتی نوٹ تحریر کر دیا تھا۔ جو ہم حرف بحرف یہاں نقل کئے دیتے ہیں اس کی اہمیت کا ناظرین خود اندازہ کر لیں گے۔

"کلامِ اقبال اوراقِ مخزن میں ویسے تو مقبول ثابت ہو چکا ہے اور لوگ اس سے ایسے آشنا ہو گئے ہیں۔ کہ تمہید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مگر اس دفعہ حسنِ اتفاق سے ہمیں ان کی دو ایسی نظمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جو الفاظ۔ طرزِ ادا۔ اور بندش میں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک تو فارسی الفاظ سے لدی ہوئی۔ توالی اضافات کا بوجھ سر پر اُٹھائے۔ غالب مرحوم کے انداز کا نمونہ۔ آہستگی اور وقار سے چلتی نظر آتی ہے۔ اور دوسری سبک روی میں برق۔ سادہ الفاظ کا جامہ پہنے۔ اضافتوں کے زیور سے

خالی۔ اپنی سادگی پر ناز کرتی ہوئی۔ دل میں بیٹھی جاتی ہے۔ ایک سے خیالات پیچیدہ اور دقیق کے اخذ کرنے کے لئے ذہن کو فکر سے دست و گریباں ہونا پڑتا ہے۔ اور معانی ذہن میں آ آ کر دامن چھڑائے لئے جاتے ہیں۔ اور پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

بیاور ید کہ ایں جا بود زبان دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

اور دوسری سیدھی سادی آرزوؤں کی تصویریں ہیں۔ کہ دل پر نقش ہو ئی جاتی ہیں۔ ایک فلسفیت اور تصوف کے سمندر میں غوطہ زن ہے۔ تو دوسری تصور کے پر لگائے کوہ و بیابان۔ باغ و راغ کی سیر میں مصروف ہے۔ اور جو کچھ دیکھتی ہے۔ اس پر مصوری کا افسوں پڑھ رہی ہے۔ ہم ان دونوں کو اس لئے یکجا چھاپتے ہیں۔ کہ مصنف کے دونوں رنگوں کا اندازہ ہو جائے۔ جب کئی لوگوں نے اقبال کی مشکل پسندی کی شکایت کی۔ تو ہم نے اس اظہار رائے کو ان تک پہنچا دیا۔ جو جواب اُنہوں نے دیا۔ وہ یہی تھا۔ کہ جہاں خیالات دقیق اور مشکل ہوں گے۔ وہاں زبان کا آسان ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اسی بنا پر وہ مرزا کی دشوار پسندی کو نہ صرف معذوری بلکہ ضرورت قرار دیتے ہیں۔ اور یہی برہان اپنے مرغوب انداز کے حق میں رکھتے ہیں۔ انہوں نے دوسری نظم میں یہ دکھا دیا ہے۔ کہ آسان نویسی میں بھی بند نہیں۔ گو جن مسائل کا ہجوم ان کے دل کے گرد رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ آسان الفاظ کے لباس میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے"

اہل ہوش بخوبی سمجھتے ہیں۔ کہ اقبال کا خطاب عوام کو نہیں۔ وہ صرف انہی لوگوں کو مخاطب کر رہا ہے۔ جو اہم امور ملیہ کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے

ہیں۔ وہ جذبات عامہ کو نہیں بھڑکاتا۔ شورش اس کا مقصد نہیں۔ فوری انقلابات میں وہ فلاح قومی نہیں دیکھتا۔ وہ نمو کا قائل ہے۔ وہ دماغ کی اعلیٰ ترین تحریکوں سے دل کے افضل ترین ولولے اُبھارتا ہے۔ دل اور دماغ کی اشتراکی قوت عمل سے کمال انسانیت کے جلوے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے خیالات عالم روحانیات کے پرتو ہیں۔ اور عوام الناس کے فہم و ادراک سے قاصر ہیں۔ اور اس کی زبان بھی خیالات کے مطابق دقیق ہوتی ہے۔ اور ہر ایک آدمی کو اس سے حظ اُٹھانا میسّر نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اقبال کی بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ اپنے اسلوب بیان کے لئے موقع اور محل ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر مضمون وقت طلب۔ اہم ہے۔ اور رہنمایان قوم ہی مخاطب ہیں۔ تو اس کی زبان مشکل اور دقیق نظر آئیگی۔ اگر وہ عوام کو کوئی بات سمجھانا چاہتا ہے۔ تو اس وقت اس کا کلام عام فہم ہوتا ہے۔

"شکوہ" اللہ سے عام مسلمانوں کو ہے۔ اور انہی کی زبان سے ہے۔ اس کا مقصد عوام کو ان کی پستی اور ذلّت محسوس کرانا تھا۔ اور اقوام عالم میں ان کی کم مائگی دکھانا تھا۔ اور اسی لئے انہی کی سہل اور سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

"جواب شکوہ" بھی اسی قبیل سے ہے۔ عامہ مسلمان اس کے مخاطب ہیں۔ ان کی نکبت و ادبار کی وجہ۔ شعار اسلامی سے ان کی بیزاری بتائی گئی ہے۔ اور ان کی ان تلخ کامیوں کے اظہار کے لئے بھی شاعر نے انہی کی زبان اختیار کی ہے۔

"شمع و شاعر" میں مضمون نے طرز بیان بدلا ہوا ہے۔ ادق اور پیچیدہ

مسائل ہیں۔ جو تخیل نے زبان شمع سے نکلوائے ہیں۔ قوم کے رہنما اس کے مخاطب ہیں۔ اور اس خطاب کے لئے اسلوب بیان بھی دقت اپسند واقع ہوا ہے۔

خضرِ راہ میں مضمون پیچیدہ ہیں لیکن حضرت خضر کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان کی عمر اور ان کے تجربہ نے ان کی گفتگو میں تخیل کی مشکل پسندی کو کم کر دیا ہے۔ اور اس سے وہ شمع کی زبان کی نسبت محض تخیل ہی تخیل ہے۔ سادہ الفاظ میں بول رہے ہیں۔ البتہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض اوقات شاعر کے ہنر نے دقیق مسائل کو سہل ترین انداز میں بیان کر کے زبان کی دقت آفرینیاں اس خوش اسلوبی سے مٹا دی ہیں۔ کہ سلاست سو جان سے قربان ہوتی ہے۔

چھپنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداع غنچہ میں ہے رازِ آفرینش گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دار ہستی ہے
سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

پرندہ کی فریاد بھی اسی قبیل سے ہے۔ دیکھئے۔ حب الوطنی اور آزادی کتنی برجستہ کس لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔

چاند اور تارے زندگی کی حقیقت پر ایک دوسرے سے گفتگو

کر رہے ہیں۔ ہمارا حقیقت ترجمان شاعر بتا رہا ہے۔ اور ہمیں اس سے آشنا کرانا چاہتا ہے۔ زندگی کی حقیقت ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور ہر ایک فرد بشر کے لئے اس کا سمجھنا ضروری ہے۔ شاعر بھی یہی چاہتا ہے اور اسی لئے عام فہم زبان میں راز کی بات کہہ دی ہے۔

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے
تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر
ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا
چلنا چلنا مدام چلنا

بے تاب ہے اس جہان کی ہر شے
کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب
تارے، انسان، شجر، حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئیگی نظر کیا
کہنے لگا چاند - ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق انتہا حسن

شوکت بیان (۱۲) اقبال کے شعروں میں زور کلام۔ شوکت بیان جا بجا پائے جاتے ہیں۔ اس کے مضامین بلند ہوتے ہیں۔ اور اس کے تخیل کی پرواز عرش بریں تک کی خبر لاتی ہے اور اسی وجہ سے اس کے الفاظ۔ اس کی بندشیں اور ترکیبیں چست اور شاندار ہوتی ہے۔ اس کی باتیں دل سے نکلتی ہیں۔ اور دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے

اسے شکوہ بھی ہوتا ہے۔ تو اللہ سے۔ اور اس کے بے باک نالے آسمان کو چیر کر عرش بریں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ اسرار زندگی سے واقف ہے۔ موت کا راز دار ہے۔ اسے حیات کی تڑپ بے تاب رکھتی ہے۔ اور موت کی ہنگامہ آرائی اسے بے قرار کئے دیتی ہے۔ موت و حیات پر اکثر اس کے جذبات پر جوش اور اس کا کلام زور دار ہوتا ہے۔

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت

دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں
نے مجال شکوہ ہے، نے طاقت گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوق گلو افشار ہے

موت کا ذکر تو اس جوش و خروش سے ہے۔ مگر زندگی کی ماہیت پر بھی اس کے جذبات اسی آب و تاب سے۔ اسی جوش، اسی زور سے، بلکہ بڑھ چڑھ کر دل سے زبان پر آتے ہیں۔ اور سننے والوں کو متحیر کر دیتے ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جان اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو

پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

انسان کی ہستی کا راز کیا ہے ۔ اس کی اصلیت کیا ہے ۔ سوالات ہیں جو شاعر کے دل میں ایک طوفان بپا کئے ہوئے ہیں ۔ اس کا حقیقت نما دل راز کی اہمیت محسوس کرتا ہے ۔ اور اسی اہمیت کی شان اپنے احساس میں پاتا ہے ۔ جو شوکت بیان میں جلوہ پیرا ہے ۔ انسان کو اس کی اصلیت ۔ اس کی حقیقت سے آشنا کراتا ہے ۔ اور الفاظ کی شوکت ۔ بیان کی تمکنت سے وہ اثرات پیدا کرتا ہے ۔ کہ سننے والے اس کے ساحرانہ انداز سے مسحور ہو کر ممکنات زندگی کے جذبات دلوں میں موج زن پاتے ہیں ۔ اور شاعر کی نغمہ ریزیوں کے جادو سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو اس کے ہم آہنگ پاتے ہیں ۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آ کر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو لیلیٰ بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو

غوف باطل کیا، کہ ہے غارتگر باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

علو خیالی اور بلند پروازی دیکھنی ہو تو طلوع اسلام میں

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے الخ

مثال کے طور پر ملاحظہ طلب ہے۔ اور یوں تو کلام اقبال ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس خصوصیت میں ممتاز نظر آئیگا۔

سوز و گداز — اقبال کے کلام میں جا بجا سوز و گداز کی آہیں اور درد کے نالے سنائی دے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کہ اس کے سوز میں حالی کی کسک نہیں۔ اور اس کے نالے بلبل ہند کے دل گداز اثرات پیدا نہیں کرتے اس کے سوز میں بھی اک شان ہے۔ اس کے نالوں میں بھی اک شوکت ہے۔

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی

شہر ان کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

سطوت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی

وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی

وہ نگاہیں نا امید نور ایمن ہو گئیں

رنج اور اندوہ اسے ستاتے ہیں۔ اس کے دل میں۔ تن من میں۔ آگ لگا دیتے ہیں۔ وہ جلتا ہے۔ لیکن راکھ ہو کر خاموش نہیں ہوتا۔ اس کی آہیں فضا میں تیرگی نہیں پھیلاتیں۔ بلکہ منہ سے شرارے نکالتی ہیں۔ اور دوسروں کو جلا کر چراغاں کرنے پر آمادہ اور مستعد ہیں۔ اس کے نالے

دلوں کو گداز کر کے بٹھا نہیں دیتے۔ بلکہ جوش میں لا کر ابھارتے ہیں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز
لے رہا ہے مے فروشان فرنگستاں سے پارس
وہ مے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے، تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
مے ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

رومی کا حوالہ صاف بتا رہا ہے۔ کہ اقبال کے سوز میں افسردگی نہیں۔ وہ بربادی میں نئی آبادی کی رونق پاتا ہے۔ وہ جل کر راکھ ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس کی راہبی عقیدت آگ میں بھی گل و گلزار دیکھتی ہے۔ اور سوز میں ساز کے نغمے سنتی ہے۔ ہلال عید دیکھئے۔ کیا ہی اسلوب ہے کیا ہی دلسوز نظارے ہیں۔

دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ

بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارش سنگ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امت مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے ان کی خودداری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطف تکلم سے کیا
اس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

مگر ساتھ ہی ہمارے کان میں یہ آواز بھی ڈال رہے ہیں۔

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ
شورش امروز میں محو سرود دوش رہ

تشبیہات اور استعارات

(۶) اس کا کلام دلکش تشبیہات سے مزین ہے۔ اور طرب انگیز استعاروں سے مملو۔

(ک) زندگی اور موت کی تصویریں کیسی دل لبھانے والی اور لطیف ہیں۔

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

آہ! کیا آئے ریاض دہر میں ہم کیا گئے
زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

(ب) مسلم کی حیات ملی کا نقشہ کس حسن و نزاکت سے کھینچا ہے۔ پہلے عالم میں اسلامیوں کا فوری تسلط۔ ان کا اسلامی تمدن کی آبیاری سے دنیا کو شاداب و سرسبز بنا دینا۔ اور پھر خود الگ تھلگ ہو جانا جادو کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اور فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابر آذاری اٹھا برسا گیا

(ج) بلبل کی پھڑکتی ہوئی تصویر کس قدر پیاری ہے۔
اور بلبل مضطرب رنگین نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں
عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

(د) آج کل کے مسلمانوں کی زندگی کا ساز اور اس کی سریں بھی سننے کے قابل ہیں۔

کشتی ساز معمور نوا ہائے کلیسائی

(ہ) اور نمود صبح میں۔ عالم شہود سے نجم سحر کی روانگی عجیب انداز سے دکھائی گئی ہے۔

ہے رواں نجم سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابد شب زندہ دار

(و) والدہ مرحومہ کی تصویر کا اعجاز ملاحظہ ہو۔

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا
عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

دن) گھٹا کو شہ کدہ بے خروش باندھا ہے۔ اور داغ کا مرثیہ لکھتے ہوئے دلی کو "بیت الحرام مذہب اہل سخن" کے نام سے یاد کیا ہے۔ بچّہ کی تتلاہٹ میں "طفلک گفتار آزما کی دعا" کا انداز ملاحظہ ہو۔

اور پھر دیکھئے اس کی دلربائی کا عکس چشموں کے "شکستہ گیت" میں کمال حسن و لطافت کا ثبوت دے رہا ہے۔

جوش بیان — ملکی اور ملی جذبات کی ہنگامہ آرائیاں اقبال کے دل میں ایک محشرستان بپا کر دیتی ہیں۔ جذبات کا جوش و خروش دل سے زبان پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ الفاظ ساحرانہ ہم آہنگی سے گوش ہوش پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ حیرت اور استعجاب آنکھیں کھول کھول کر دیکھتے ہیں۔ اور سننے والا مدہوش ہو جاتا ہے جوش دیکھنے کے قابل ہے۔

ہوید آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑونگا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑونگا
جلاتا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے

تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑونگا
اگر غنچوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
چمن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑونگا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا
مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورت آئینہ حیراں کر کے چھوڑونگا

دوسرے لہجہ میں ہے۔

خیمہ زن ہو وادی سینا میں مانند کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گر کاشانہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجام ستم
صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

طرفگی بیان (۸) اس کے کلام میں طرفگی اور ندرت ہے۔ فلسفہ کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے لئے انوکھی طرزیں نکالتا ہے۔ اور وہ گتھیاں اپنی قادر الکلامی کے زور سے سیدھے سادے الفاظ اور دلربا تشبیہوں کے رنگ میں کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اور

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اور
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

اور تصوف کے مسائل بیان کرنے میں بھی ایک جدت ظاہر کرتا ہے۔

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

موسیقیت (۹) ابتدا میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلاسوں میں اپنے خاص انداز میں نظمیں پڑھیں۔ اس سے سامعین میں شعر پڑھنے کا ایک خاص مذاق پیدا ہو گیا۔ اور ہر کوئی اسی انداز میں نغمہ سرائی کا شوق کرنے لگا بعض طالب علموں نے تو اس میں ایسا کمال حاصل کیا۔ کہ پس پردہ آواز سے اصل و نقل میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ اور اسی پر اقبال نے کہا۔

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اقبال اپنی سحر کاری کے لئے موزوں زمینیں انتخاب کرتا ہے۔ اور مناسب الفاظ۔ اور ترکیبوں سے کلام میں موسیقیت پیدا کر دیتا ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
اُٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
الٰہی پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

اور ۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری
میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگِ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری
مرا عیش غم مرا شہد سم مری بود ہم نفسِ عدم
ترا دل حرم گروِ عجم ترا دیں خریدۂ کافری
دمِ زندگی رمِ زندگی غمِ زندگی سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا

کہ ترے پلنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

اس ضمن میں ایک اور مثال آپ کی توجہ کے قابل ہے۔ الفاظ کی موزونیت۔ اور سب سے بڑھ کر الفاظ کی خیال سے ہم آہنگی کسی تعریف سے بالاتر ہے

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

۱۔ امید — اردو شاعری سراسر فراق اور بیوفائی کی ایک غم اندوز داستان ہے۔ عاشق حیران و سرگردان، معشوق ظالم سفاک۔ ہجر کی راتیں۔ جدائی کے دن۔ بے قراری اور آہ و زاری کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں۔ اقبال کے کلام میں نا امیدی کی سُریں۔ اور آہ و بکا کمیاب ہے اس کے نالے بھی نئے انداز کے ہوتے ہیں۔ اسے شامِ غم بھی صبحِ عید کی خبر دیتی ہے۔ اور ظلمت شب میں اسے امید کی کرن نظر آتی ہے۔ خدا کے سامنے بھی جب قوم کا شکوہ کرتا ہے۔ اور شکایتوں کا ایک دفتر کا دفتر کھول دیتا ہے۔ امید کی جھلک سے نا آشنا نہیں۔

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
طور مضطر ہے اُسی آگ سے جلنے کے لئے

امید بھی ایسی نہیں جو محض خواہشات کے درجہ سے آگے نہ بڑھی ہو۔ بلکہ فرحت افزا امید۔ جس میں وثوق کی پختگی نمایاں ہے۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار

نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

ہمارا شاعر تو ستاروں کی تنک تابی میں صبح روشن کی آمد دیکھتا ہے۔ اور تلاطم ہائے دریا میں گوہر کی سیرابی پاتا ہے۔ اور اسی آب و تاب سے انہیں جلوہ گر کرتا ہے۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی۔ ذہنِ ہندی۔ نطقِ اعرابی

اس کا طرب اندوز دل۔ بہار اور نگار کے جلووں سے بے تاب ہے۔ اور موسیقیت کی برقی لہروں کے تموج میں نغمہ پرواز۔

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی

که خیل نغمه پردازاں قطار آمد قطار آمد

کنارہ از زاہداں برگیر و بیباکانه ساغر کش

پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیث خواجہ بدر و حنین آور

تصرفہائے پنہانش بچشم آشکار آمد

دگر شاخ خلیل از خون ما نمناک میگردد

ببازار محبت نقد ما کامل عیار آمد

سر خاک شہیدے برگہائے لالہ مے پاشم

که خونش با نہال ملت ما سازگار آمد

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم

فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

ارضی مناظر قدرت سے اسباب

اقبال مناظر قدرت اور مادی دنیا سے اخلاقیات۔ معاشرت۔ اور سیاسیات کے زرّیں اصول اخذ کرتا ہے۔ اور مسائل فلسفہ کے ایسے نکات کا استدلال کرتا ہے جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے مضمون آفرینیاں دلفریب اور حیرت انگیز ہیں۔

جمعیت

(۹) اقبال جمعیت اور ربط ملت کا قائل ہے۔ اور اس کی نظمیں مختلف پیرایوں میں اسی اصول پر منحصر ہیں مختلف مناظر قدرت میں اس کے فلسفی تخیل نے اسی اصول کی حمایت میں زبردست دلیلیں پائی ہیں۔ قطرے کی زندگی۔ دریا کی موج اور درخت سے ٹوٹی ہوئی سوکھی ٹہنی میں شاعر نے یہی اصول ساری دیکھا۔ اور قوم کی رہنمائی کے لئے اپنے دلفریب اور دلکش انداز میں بیان کر دیا۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

وہ اسرارِ حیات کیا ہیں۔ ذیل کی سطور سے معلوم ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہی قطرہ کبھی شبنم کی بوند۔ کبھی آنکھوں میں آنسو۔ اور کبھی دریا میں موتی ہوتا ہے۔ شکل و صورت تو وہی ہے مگر قسمت کے پھیر میں بیّن فرق ہے

کہیں سامانِ مسرت، کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

شبنم کی بے مقدوری۔ آنسو کی رنج و اندوہ کی زندگی۔ اور موتی کی قدر و منزلت۔ زندگی کے مختلف مدارج کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک انسان کو بھی ایسے ہی مختلف مدارج زندگی کا سامنا ہے۔ مدارج جو اٹل قانون قدرت نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اور کسی کو ان سے مجالِ گریز نہیں۔

قطرہ کی زندگی کی ان منازل سے یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے۔ کہ جمعیّت میں لازوال برکتیں ہیں۔ شبنم کی تنہائی پسند بوند۔ قطرہ کی انفرادی پیدائش۔ انفرادی زندگی۔ اور چند لمحوں کی حیات کا آئینہ ہے آنسو کی منزل ہیں۔ قطرہ جمعیّت اور سلسلہ حیات میں آنکھ کے پانی تک محدود ہے۔ اور اس کا انجام بھی ظاہر ہے۔ لیکن بحرِ بے پایاں کا قطرہ اپنی کثیر جمعیّت میں رہ کر۔ دُرِ شاہوار کی صورت میں اپنی ہستی قائم کرتا ہے۔ اور رکھتا ہے جس کی آب و تاب۔ پائداری اور قدر و منزلت کے آگے شبنم اور آنسو کی بوندوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور یہی ایک حالت ہے۔ یہی ایک کثیر جمعیّت سے وابستگی کی حالت ہے۔ جو کسی انسان کو موتی کی طرح باآبرو اور متصدر رہتا ہے اور دیرپا زندگی بخشتے

کی کفیل ہو سکتی ہے۔

(۲) فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تخیل اور حسن ادا دیکھئے۔ سیدھی سادی بات تھی۔ شاعر کی نظر اور زبان نے اس میں کیا ہی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ موج کی ہستی دریا کے ساتھ وابستہ ہے۔ دریا کے باہر دیکھو موج کہاں۔ اور اسی بدیہی حقیقت سے شاعر نے استدلال کیا ہے کہ فرد کی حقیقت انفرادی کچھ بھی نہیں۔ ملت کا ایک جزو ہونے میں ہی اس کی ہستی کا راز ہے۔ اگر ملت سے الگ ہوا تو اس کا بھی وہی حال ہوگا جو موج کا دریا کے باہر ہوتا ہے۔ اور اس اصول پر ہی اقبال کا مشورہ ہے۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدائے ملت ہو یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا

(۳) شیخ سعدی کے ہوشیار آدمی کی نظر برگ درختان سبز میں معرفت کردگار کے دفتر دیکھتی ہے لیکن اقبال کی نکتہ سنج نگاہ میں درخت سے ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنیاں بھی حضرت انسان کی سبق آموزی کے لئے دبستان کھولے ہوئے ہیں۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

یہ ٹوٹی ہوئی سوکھی ڈالی شاعر کے فلسفی دماغ میں خیالات کا ہجوم پیدا

کر دیتی ہے۔ اور اس خشک جادو کی چھڑی کے اثر سے اسلامیوں کے اُجڑے باغ کی گئی گذری بہار کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے باغ زرِ گل سے مالا مال نظر آتا ہے۔ اور اس کے سایہ دار درختوں کے کنارِ عافیت میں پرندوں کے نغمے سنائی دیتے ہیں۔ یک لخت منظر بدل جاتا ہے۔ باغ میں خزاں کے ڈیرے لگے ہوئے ہیں۔ گل اور زرِ گل سب لُٹ چکے ہیں۔ اور خوش نوا جانور جو ابھی ابھی گا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے اُڑ گئے ہیں۔ شاعر مسلم نادان کو مخاطب کرتا ہے۔ اور حقیقت حالات کی طرف اس کی توجہ دلاتا ہے۔

فصلِ خزاں ہے تیرے گلستاں میں خیمہ زن
خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

اور اسے تنبیہ کرتا ہے۔ کہ

شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
واقف نہیں ہے قاعدۂ روزگار سے

قاعدۂ روزگار کیا ہے۔ وہی جسے علم والے قانونِ قدرت اور فقیہ سنت اللہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہی ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنیاں زبانِ حال سے بتا رہی ہیں۔ کہ شجر سے الگ ہو کر ہرا ہونا ناممکن ہے۔ جمعیت سے علیحدگی موت ہے۔ اور اسی لئے اگر زندہ رہنا ہے تو

مذہب کے ساتھ واسطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

تلقین گل

(ب) اگر اُدھر شاخ بریدہ کی سبق آموزی ہے۔ تو اُدھر گل بھی چشم بینا۔ اور گوش شنوا کے لئے اسباق کا ایک دفتر کھولے ہوئے ہے۔ اور اقبال قدرت کا راز دار ہیں بھی گاہے گاہے ان اسرار سے واقف کر دیتا ہے۔ انداز بیان نرالا ہے۔

تجھے کیا فکر ہے اے گل دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
اگر منظور ہے تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں
تو کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے
نہ ہو منت کش ساقی نگوں جام و سبو کر لے

دوسروں کی اصلاح طلبی سے پہلے خود اپنی اصلاح کی ضرورت۔ بے برگ و باری اور ناداری کی ستم شعاریوں سے محفوظ رہنے کے گر۔ آبرو کی تمنا کی اُلجھنوں میں اور تکالیف میں استقلال کی عادت۔ استغنا اور خودداری کے زریں اصول۔ پھول کی زبان حال سے خود اسی کو مخاطب کر کے کمال خوبی و لطافت کے پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

کس شان اور کس انداز سے خودداری کا سبق دیا ہے۔ گل چیں باغ میں آتا ہے۔ گل کا جوبن دیکھتا ہے۔ خودنمائی اور خود افزائی کے نشہ ہیں۔۔۔ اپنی

زیب وزینت بڑھانے کی ہوس میں ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اور پھول کو اس کے نشیمن سے شاخ گل سے الگ کر لیتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ پھول اپنی حالت کی اس تبدیلی پر غور کرے۔ گلچیں اُسے سر پر اُٹھا لیتا ہے۔ اور گلے لگا کر اسے عزّت و وقار کی جگہ دیتا ہے۔ پھول اسی میں مست ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت سے بے خبر اپنی اصلیت اور موجودہ حالت کی ذلت کو مطلق محسوس نہیں کرتا۔ اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

اقبال مطمئن نہیں۔ وہ دیکھتا ہے۔ کہ حیات انسانی کے مختلف مراحل ہیں۔ یہی گل چیں۔ یہی گل۔ یہی دستبرد۔ یہی خود نمائی۔ خود فراموشی اور خود فروشی نمایاں ہیں۔

وہ ہمیں کس لطافت کس خوبی سے سمجھاتا ہے۔ کہ یار لوگ اپنی اغراض کے لئے۔ ہمیں محبّت سے ملتے ہیں۔ اپنے پاس عزّت کی جگہ دیتے ہیں۔ سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ اور ہم اس پر خوش ہیں۔ اور محسوس نہیں کرتے۔ کہ ہم بے وقوف بنائے جا رہے ہیں۔ ہماری خودداری پامال ہو رہی ہے ہمیں اپنے نشیمن سے باغ و بہار کے نشیمن سے۔ خود غرضی کے دست تطاول نے الگ کیا ہے۔ اپنی مجلسیں سجائی ہیں۔ اپنی رونقیں بڑھائی ہیں۔ اور ہم اترا رہے ہیں۔ کہ ہماری عزّت افزائی ہو رہی ہے۔ کاش انسان سمجھے۔ کہ ایسی ایسی خدمت گذاریاں۔ ایسی ایسی دل نوازیاں اس کی خودداری کی منافی ہیں۔ اس کی خودی کو فنا کر دیتی ہیں۔ اسے احساس ہونا چاہئے۔

نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

باغ میں جا کر سرو آزاد کو جو پا بگل دیکھا۔ اقبال نے حصول آزادی کو قانون

قدرت کے مطابق - پابندیوں سے آزاد نہ پایا - بول اُٹھے -

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کرلے

اس نظم کے آخری شعر میں -

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کرلے

رمز آشنا شبنم - غنچۂ گل سے جو رنگ و بو کا دل باختہ ہے کس حسن ادا سے اس کے سامان دل باختگی کی حقیقت کھول کر اڑ گئی ہے - اور یہ بتا گئی ہے - کہ رنگ و بو ہی متاع دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے - اور یہی ہماری ساری تکالیف و مصائب کا ساز و سامان ہے - اگر کسی کو تکلیف اور مصیبتیں اٹھانے کا شوق ہو تو بلاشک یہ ساز و سامان پیدا کرلے اور پھر جو کچھ بھی اس کے نتائج ہوں - برداشت کرے - اگر ایسا نہیں - اور عافیت مطلوب ہے - تو ان سے مستغنی ہو جائے - اور آرام و اطمینان سے اپنی زندگی گذارے -

عالی ہمتی (ج)

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

عالی ہمتی کا سبق مہتمم بالشان انداز میں دے رہا ہے - اور دانہ کی مثال سے مسکنت اور زبون حالات زندگی میں بھی - خاک نشینی کی پستی سے اُبھرنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانے کی تشویق دلاتا ہے - دانہ کو خاک میں ملا دیا جاتا ہے - لیکن اس افتاد سے دانہ دبتا نہیں - بلکہ پنپتا ہے ہے - اور بڑھتے بڑھتے قدِ آدم کھڑا ہو جاتا ہے - اور اس ایک خاک

ہیں دبے ہوئے دانے کا عصا سینکڑوں نوزائدہ دانوں کا پشت پناہ اور حامی بن کر مرجعِ خاص و عام ہوجاتا ہے۔ یہی ہمت۔ یہی قوت بالیدگی۔ یہی طاقت عمل۔ انسان کی زندگی کا خاصہ ہونی چاہئیں۔ اور چشم بینا کے لئے۔ شاعر نے یہاں صراحتاً بتا دیا ہے۔ قانون قدرت کی یہی تعلیم ہے۔

خودداری | (۵) تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو

عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

اگر وہاں خاک میں دبا ہوا دانہ علو ہمتی کا سبق دیتا ہے۔ تو یہاں پانی سے گھرا ہوا حباب خودداری اور استغنا کی تلقین کر رہا ہے۔ حباب جانتا ہے۔ کہ اس کی ہستی دریا کی ممنون ہے۔ اور وہ دریا کے آغوش ہوا خواہی میں پھلا اور پھولا ہے۔ اس کی آنکھ دیکھ رہی ہے۔ کہ دریا کی لہریں۔ خویشی تو در کنار حقوق ہمسائگی کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے خشک لب ساحل کو ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک سرسبز و شاداب کر رہی ہیں۔ لیکن اس کی خودداری دریا کے عین آغوش میں۔ اس کی آبیاریوں کی اس فیض رسانی میں بھی۔ اپنی ہستی کی ابتدا اور اپنی تربیت کی ضروریات سے بے پرواہ۔ دریا سے ایک قطرہ کا بار منت اٹھانے کے لئے بھی تیار نہیں۔ وہ اپنا پیمانہ حیات نگوں رکھنے میں ہی زندگی سمجھتی ہے۔ اور علی الاعلان کہہ رہی ہے۔ کہ استغنا میں ہی زندگانی ہے۔ شاعر نے حباب کی سرنگونی میں خودداری کی سرفرازیاں ملاحظہ کی ہیں۔ اور اہل بینش کے لئے ان کی جلوہ نمائیوں کے مناظر بے نقاب کر دئے ہیں۔

پابندی آئین | (۶) دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے

موج کو آزادیاں سامان شیون ہوگئیں

دریا میں موج کے شور و شیون نے فکر شاعر کے لیے سیاسیات کا ایک مدرسہ کھول دیا ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ کہ موج اپنی ندی کے مقررہ راستوں سے غیر مطمئن ہو کر آزادی کی لہروں پر اچھلتی کودتی ہے۔ اور آخر آزادی کی اس تگ و دو میں پتھروں سے سر ٹکراتی ہے اور پھر نا ہموار زمین کے تصادم سے زخم خوردہ ہو کر شور و شیون کرنے لگ جاتی ہے۔ شاعر کی نگاہ میں آزادی کی ایسی چالیں وبالِ جان نظر آئیں۔ مقررہ راستوں سے سرکشی خطرناک دکھائی دی۔ اور دنیا میں رہنے کے لیے آئین کی پابندی بہرحال ضروری معلوم ہوئی۔ مشاہدات قدرت نے ایک زرّین اصول کا پتہ دیا۔ کہ

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

سادہ زندگی اور ذوقِ عمل۔

(د) مظاہرات فطرت سے سادہ زندگی اور ذوقِ عمل کی تلقین کس خوش اسلوبی سے ہو رہی ہے۔

زہر میں ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں آیا جو ہوا

صحرا۔ سادہ اور جفاکشی کی زندگی کا میدان ہے۔ اور ایسی زندگی میں ہی بحر کی آزادیاں۔ اور قوت عمل۔ حاصل ہو سکتی ہیں۔

گلشن کی آرامگاہ میں ندی کی تنگ ہستی سے اس کی پابندیاں اور بے مقدوری ظاہر ہیں۔ اور انہی اصول پر شاعر نے ہمیں سمجھایا ہے۔ کہ سادہ اور جفاکشی کی زندگی میں ہمیں ویسی ہی آزادی اور وسعت عمل نصیب ہو سکتی ہے۔ جیسے صحرا میں دریا کو ہے۔ لیکن تن آسانی کے مزے باغ بہار کی عیش پسند زندگی میں کم ہمتی اور کم مائگی پیدا کر دیتے ہیں

اور یہ بات دریا کی شان سے نمایاں ہے۔ جو صحرا کی وسیع جولانگاہ چھوڑ کر گلشن کے تنگ احاطہ میں آنے سے ایک بے حیثیت ندی بن گیا ہے۔

فلسفہ زندگی

(۳) فلسفہ زندگی کی نکتہ آفرینیاں حیرت و استعجاب کی صورتیں دکھاتی ہیں۔ اور حیات و ممات کے معنے خیز دلچسپ مناظر دکھا کر پریشاں دلی کو تسکین و اطمینان کی فضاؤں میں سُلا دیتی ہیں۔

(۱) شہر لاہور دریائے راوی کے کنارہ پر آباد ہے۔ دریا کے ایک طرف شہر اور قلعہ شہر۔ اور دوسری جانب نور الدین جہانگیر۔ اس کی چہیتی ملکہ نور جہاں۔ اور وزیر آصف جاہ کے مقبرے ہیں۔ تغیرات زمانہ نے دریا کا وہ پہلا جوش و خروش ٹھنڈا کر دیا ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی راوی بھی اپنی شان و شوکت کھو بیٹھا ہے۔ اور نئے دور کی قطع و برید کے سلسلہ میں اس کی موجیں زمانہ سابقہ کی تلاطم آفرینیوں سے محروم ہو گئی ہیں۔

دریا کے کنارے۔ آب رواں کے دلفریب ترنم۔ شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ کے میناروں۔ اور سکوت شام نے شاعر کے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی۔ سرور کی لہروں نے اُسے اُبھارا ! سامنے شوکت و سطوت شہنشاہی کا مزار دکھائی دیا۔ دل بیٹھ گیا۔ بے ثباتیٔ دنیا کا عبرت انگیز نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ شانِ ایزدی نظر آ گئی۔ اللہ ہی اللہ تھا۔ محویت کے عالم میں پانی کی آواز میں اذاں سنائی دینے لگی۔ اور سرزمین خاک پاک حرم بن گئی۔

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو
سر کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

افق پر سرخی شام کی رنگین قبائی کے جلوے نمودار تھے۔ اور چلتے پانی میں پیر فلک کا کمزور ہاتھ جام آفتاب سنبھالتے لرزتا تھا۔ دن اپنی منزل پوری کر کے عدم آباد میں داخل ہو رہا تھا۔ اور شفق غروب آفتاب کی صف ماتم بچھائے بیٹھی تھی۔ اور مقبرہ جہانگیر کے مینار دور سے شہنشاہ مدفون کی تنہائی کی شان دکھا رہے تھے۔ یہ سارا منظر انقلاب دوران کی ستم شعاریوں کا آئینہ تھا۔ اور اپنے سکوت میں زمانہ کے تغیرات کی عبرت خیز کہانی بیان کر رہا تھا۔

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا
کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خوابگۂ شہسوارِ چغتائی
فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل
کوئی زمانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل
مقام کیا ہے سرود خموش ہے گویا
شجر، یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

اس سکوت کے منظر کے ساتھ ساتھ ہی شاعر کی نکتہ رس نگاہ نے دیکھا کہ

روان ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرمِ ستیز
سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِّ نگہ سے دور گئی
جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

زمانہ کے انقلابات میں انسان کی زندگی کی حقیقت کا راز افشا ہو گیا۔ دنیا میں اس کا آنا۔ اور پھر یہاں سے چلے جانا۔ پیدائش اور فنا۔ قانون قدرت کے کرشمے ہیں۔ جو گوناگوں صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ فطرت فنا سے مطلقاً نا آشنا ہے۔ البتہ تغیر اس کا اصول ہے۔ انسان مرتا نہیں عدم کی کوئی حالت نہیں۔ مرنا محض ایک دوسری صورت میں انتقال ہے اور وہاں بھی سلسلۂ حیات قائم رہتا ہے۔ اگرچہ ہماری آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔

(۲)

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی
طائرانِ آسماں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور

نہر جو تھی اُس کے گوہر پیالے پیارے بن گئے
یعنے اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
ہوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجران قطروں کا لیکن وصل کی تعلیم ہے
دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت پہ ہے نہرِ روانِ زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوع انسان بن گئی

حیات انسانی کا یہ دوسرا مرقع اپنے رنگ میں پہلی تصویر سے بھی زیادہ دلفریب ہے اور فلسفہ حیات انسانی کا ایک اہم اور دلچسپ رخ پیش کرتا ہے۔

اعلیٰ اور افضل منازل ہستی میں زندگی کا دریائے بے پایاں امنڈا آرہا ہے۔ اور عالم وجود کی سنگلاخ وادیوں میں افتاد کی ٹھوکروں سے۔

نہر جو تھی اُس کے گوہر پیالے پیارے بن گئے
یعنے اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے

زندگی کے اس انقلاب میں قطروں کی یہ انفرادی حیثیت۔ ایک دنیا تو ضرور نمایاں کر دیتی ہے۔ مگر چند روز کے لیے مضطرب بوندوں کا یہ افتراق۔ ان کی یہ عارضی فرقت انہیں پریشان کیے دیتی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ جدائی کی تقریب ہے۔ اور تھوڑے دنوں میں ہی ان کے پھر اکٹھے ہو جانے پر دلالت کرتی ہے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ دو ہی قدم پر یہی قطرے۔ انفرادی زندگی کو ختم کرکے اپنی پہلی ہیئت مجموعی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور سابقہ شان وتجمل سے اس زندگی کی پستیوں سے اچھلتے کودتے نکل جاتے ہیں۔

بستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم

عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

سماوی مشاہدات سے سبق۔ محض ارضی مناظر قدرت تک ہی محدود نہیں۔ سماوی مشاہدات میں بھی فلسفی تخیل نے نکات لطیفہ کی ٹوہ لگائی ہے۔ اور شائقین کے دل و دماغ کے لئے دلچسپی کے سامان اور سرور و انبساط کے خزانے مہیا کر دیئے ہیں۔

ل۔ دو سیاروں کے قران پر فلسفہ اور تخیل کے ملاپ نے کیا ہی رنگ جمایا ہے۔

آئے جو قران میں دو ستارے

کہنے لگا ایک دوسرے سے

یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب

انجام خرام ہو تو کیا خوب

تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو

ہم دونو کی ایک ہی چمک ہو

علم والے سمجھتے ہیں۔ کہ سیاروں کی گردش۔ حرکت کے قانون قدرت کے ماتحت ہے۔ اور اسی قانون کے زور پر جو حرکت ایک کو دوسرے سے ملاتی ہے ضرور ہے۔ کہ اسی زور سے جدا بھی کر دے۔ ملاپ میں جدائی مرکوز۔ اور وصال فراق کی دلیل ہے۔ فلسفی شاعر اسی سوچ میں تھا۔ کہ ستاروں کی اس گفتگو کی آواز اس کے کان میں آئی۔ چونک پڑا۔ دل کو ایک چوٹ سی لگی۔ وصال کی تمنا میں اسے پیغام فراق سنائی دے رہا تھا۔

لیکن یہ وصال کی تمنا

پیغام فراق تھی سراپا

تاروں کی تقدیر اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

گردش تاروں کا ہے مقدر
ہر ایک کی راہ ہے مقرر

انسانی زندگی میں بھی وہی قانون حرکت نمودار تھا۔ مقابلہ سے گھبرایا۔ اور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

ہے خواب ثبات آشنائی
آئین جہاں کا ہے جدائی

ب۔ ستارے آپ بھی روز دیکھتے ہیں۔ ان کا ٹمٹمانا مشہور ہے اقبال کی آنکھوں سے یہی ستارے دیکھے ہیں۔ لیکن اس کے دماغ نے ستارے کی جھلک میں نئی آفرینیاں کی ہیں۔ جو اسی کا حصہ ہے۔

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاع نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراس فنا صورت شرر تجھ کو
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثال ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے

ستارہ کی جھلک کو دیکھ کر شاعر نے اس کے کانپنے کا تصور باندھا ہے۔ اور پھر ستارے کو مخاطب کر کے اس کے کانپنے کے جو مختلف اسباب ہو سکتے ہیں گن دئے ہیں۔

چاند کے نکلنے اور صبح کے نمودار ہونے سے۔ اس کے مدھم پڑ جانے کی فکر حسن کا یقینی زوال اور اس لئے ستارہ کو اپنے حسن کے زوال کا خیال یا رات کی تنہائی میں متاعِ نور کے لُٹ جانے کا ڈر۔ یا شرارہ کی طرح فنا ہو جانے کا اندیشہ۔

اور ان اسباب کو گنتے ہوئے ستارے کی توجہ اس طرف بھی دلائی گئی ہے کہ آسمان تو اس پر اس قدر مہربان ہے۔ کہ زمین سے دجو اپنے خطرات کی آماجگاہ ہے کہیں دور اس کا گھر بنا دیا گیا ہے۔ اور چاند کی طرح وہاں سے اسے قبائے زر بھی ملی ہوئی ہے۔ پھر ان حالات میں بھی۔ ستارے سے پوچھا گیا ہے۔ کہ اس کی ننھی سی جان ڈر کے مارے رات بھر کیوں کانپتی رہتی ہے۔ جواب کے انتظار کی ضرورت نہ تھی۔ وجہ صاف ہے۔ اور کوئی وجہ ہو بھی نہیں سکتی۔ زوال یا دوسرے لفظوں میں فنا کا ڈر ہی ہے جس سے ستارہ کی تمام رات کانپتے گذرتی ہے۔

یہ دیکھ کر شاعر نے فنا کی حقیقت آشکارہ کردی ہے۔ اور ستارہ کو اس حقیقت آگاہی سے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔

دراصل ستارہ تو ایک بہانہ ہی تھا۔ اور اسے فنا کا خوف بھی کیا ہو گا شاعر نے اپنے لطیف انداز میں حضرت انسان کو جو موت سے دن رات کانپتا رہتا ہے مخاطب کیا ہے۔

چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ان چاروں شعروں میں تنازع بقاءِ نوعی اور انتخاب طبعی کے ادق مسائل کی طرف بھی شاعرانہ انداز میں اشارا کیا ہے۔ اور یہ ہم پر واضح کر دیا ہے۔ کہ قدرت کے کارخانہ میں سکوں محال ہے۔ تغیر ہر جگہ اور ہر لحظہ جاری اور ساری ہے۔ اگر ادھر زیادتی ہے۔ تو اُدھر کمی ہوگی۔ ایک جگہ اونچائی کرنے کے لئے دوسری جگہ کھودنی پڑیگی۔ حیات میں ممات۔ اور فنا میں زندگی ہے۔ دیکھو سورج کا طلوع لاکھوں ستاروں کو صفحہ ہستی سے نابود کر دیتا ہے۔ اور زندگی کی سرشاری خواب مرگ کی پیشرو ہوتی ہے۔ گل کی پیدائش غنچہ کے سلسلہءِ حیات کے ٹوٹ جانے میں مستور ہے۔ جب تک غنچہ غنچہ ہے۔ گل نہیں۔ غنچہ کی چتک گل کی آفرینش ہے۔ گل کی صورت نظر آئی تو غنچہ نابود ہے۔ عدم حقیقت میں عدم نہیں۔ بلکہ ہستی کا مظہر ہے۔ عدم سے ہستی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور دنیا میں کسی چیز کو سکون نہیں۔ صرف تغیر ہی ایک چیز ہے۔ جو قائم ہے۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

۱۳۔ واقعہ نگاری تمسخرانہ لہجہ میں

واقعہ نگاری میں زبان کی سلاست اور روانی نمایاں ہیں لیکن سیدھے سادے واقعات بیان کرتے ہوئے بھی شوخیاں دکھلاتے ہیں۔ اور ہنسی مذاق میں دُور کی بات عجب انداز سے کہہ جاتے ہیں۔

زہد اور رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی
کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی
لبریز مے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں درد خیال ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیل علی ہم نے سنی اس کی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی
رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی
اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا ز رہ قرب مکانی
خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

صاف ظاہر ہے کہ اس تصویر کو شاعر کی خوش طبعی کے
واقعہ نگاری متانت کے رنگ میں۔
رنگ میں اتارا گیا ہے۔ مگر زندگی میں واقعات سے معلوم ہے۔ اور ان کے بیان کرنے میں شاعر کو اپنے فن صورت گری کی بہترین صناعی عمل میں لانی ہوتی ہیں۔ مصوری میں صحیح اثر پیدا کرنے کے لئے جزئیات کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ایک لکیر کا ادھر ادھر ہونا۔ ایک نقطہ کی کمی یا بیشی اہمیت رکھتے ہیں۔ جو کل تصویر میں ہر آن مد نظر رہتی ہے۔ لیکن شاعری میں خیال جزئیات اگر حد سے بڑھا۔ تو خوبی اور لطافت کا

رنگ جو تخیل کا حصہ ہے مفقود ہو جاتا ہے۔ یہاں کچھ بیان ہوتا ہے۔ کچھ بیان ہی نہیں ہوتا۔ کچھ الفاظ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور کچھ تخیل جلوہ آرا کر دیتا ہے۔ ہنر مصوّر اور شاعر دونو کا ہنر اسی میں ہے۔ کہ اصل واقعہ۔ اپنی اپنی جگہ پر اس انداز اور رنگ سے پیش کریں۔ کہ دیکھنے والا دیکھے اور تڑپ اُٹھے۔ سننے والا سنے اور بیقرار ہو جائے۔

تاریخ سلطنت مغلیہ میں غلام قادر روہیلا نمکحرامی۔ بے رحمی۔ اور کینہ پروری کی ایک عدیم المثال شخصیت ہے۔ اپنے آقا شاہ عالم بادشاہ دہلی کے ساتھ اس کا ظالمانہ سلوک کون نہیں جانتا۔ اقبال نے اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ نظم یہاں کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ پڑھنے یا سننے پر دل کی کیفیت خود ہی بتا دیگی۔

روہیلا کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ظالم نے
یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے
بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کش کی ممکن تھی
شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے
بنایا آہ! سامانِ طرب بیدرد نے ان کو
نہاں تھا حسن جن کا چشمِ مہر و ماہ و اختر سے
دل نازک لرزتے تھے قدم مجبورِ جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے
یونہیں کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اسکی

کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے
کمر سے اٹھ کے تیغ جاں ستاں آتش فشاں کھولی
سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے
رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشم احمر سے
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں کے
نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہیئے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا
کہ غفلت دور ہے شان صف آرایان لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

۱۵ مناظر قدرت کی تصویریں

مناظر قدرت کی تصویریں بھی عجیب دل فریب اور دلکش ہیں ۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب !
کیا لطف ! انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پہ تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو

سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

آرزو ہے۔ کہ جنت نگاہ فردوس گوش کا مرقع ہے۔ آنکھ نظارہ کی سحر آفرینیوں سے محو حیرت ہے۔ اور کان کوئل اور بلبل کی ترنم ریزیوں سے مست سرود۔ لطافت بیان۔ اور سلاست زبان۔ دل کو مسخر کر لیتی ہے۔ اور خیال کی رفعت اور آرزو کی پاکیزگی اس میں جذبات لطیفہ پیدا کر دیتی ہیں۔ ہم شاعر کی آرزو پڑھتے ہیں۔ سنتے ہیں۔ اور سرور و انبساط سے سرشار۔ جذبات عالیہ سے مخمور۔ اپنے آپ کو حالت وجد

ہیں پاتے ہیں۔ اور مدہوش ہو جاتے ہیں۔

'نمودِ صبح' کا نظارہ کیا ہی دلچسپ ہے۔

ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوش گوار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار
جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

'ایک شام' بھی اپنی فسوں کاری میں لاجواب ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

مناظر قدرت میں سکون اور تنہائی کا نقشہ دوسرے رنگ میں دکھایا ہے۔

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

مشاہدات فطرت میں رنگا رنگ زندگی کی تصویر بے نظیر ہے۔

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل
وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب

جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں

اہل ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

جذبات کی تصویریں

خیالات - جذبات - اور کیفیات کا ادا کرنا ایک مشکل امر ہے۔ لیکن اقبال کا تخیل اس میں بھی مشاق ہے عقل و عشق کی تصویریں کھینچی ہیں - اور صورت گری کی داد دی ہے حسن ادا لاجواب ہے

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل

عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

جذبات کی تصویریں دوسرے رنگ میں

شاعری مصوری ہے۔ جذبات و کیفیات کی تصویریں جو اقبال کی جادو قلم صناعی نے کھینچی ہیں۔ آپ نے دیکھی ہیں لیکن اس کی قوتِ متخیلہ جذبات و خیالات کی تصویریں ایک اور پیرایہ میں بھی حسن و لطافت کے رنگ میں زیب قرطاس کرتی ہے۔ جیتی جاگتی تصویریں جو ہمارے سامنے چلتی پھرتی ہیں۔ بولتی ہیں۔ نگاہِ شوق انہیں دیکھتی ہے۔ اور ذوق کے کان سنتے ہیں۔ جادو گر کی معجز نمائی — تصویروں کی دلفریبی میں حیرت و استعجاب - فرحت و سرور کی پیہم متوالی - ساحرانہ لہروں سے۔ دیکھنے اور سننے والوں کے دل و دماغ پر قابو پالیتی ہے۔ اور ان میں ایک کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ جو بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ تصویریں محض دل بہلانے کے لئے نہیں۔ شاعر اپنی کمال فنی سے اوّل اوّل ہمیں تصویر کے خط و خال کی سحر آفرینیوں پر مفتون کر دیتا

ہے۔ اور بعد میں ہماری اس قنائیت کو ان اصول اخلاقیہ یا سیاسیہ کی طرف بتدریج رجوع کرتا ہے جن کی تلقین پیاری پیاری تصویریں دلکش اشاروں اور دلآویز کنایوں سے ملحظہ کر رہی ہیں۔

انہی تصویروں کے مرقع میں سے آفرینش محبت ہے۔ تصور خیال نادری حسن ادا۔ خوبی اور لطافت میں آپ ہی اپنی نظیر ہے۔

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی ناآشنا خم سے
ستارے آسماں کے بےخبر تھے لذت رم سے
قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
نہ تھا واقف ابھی گردش کے آئین مسلّم سے
ابھی امکاں کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی دنیا
مذاق زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے
کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشم خاتم سے

یہ چاروں شعر ابتدائے آفرینش عالم کی حالت آشکار کرتے ہیں۔ ابھی دنیا امکان کے ظلمت خانے سے ابھری ہی تھی۔ اندھیری رات تھی۔ تارے سکون میں تھے۔ اور چاند بھی بیگانہ وار کھڑا تھا۔ حرکت کہیں نام کو نہ تھی۔ اور زندگی کے آثار کہیں پائے نہ جاتے تھے۔ خود رات بھی تا حال جوں کی توں قائم۔ تارے ذوق سیر سے بےخبر۔ اور چاند گردش کے چکر سے ناآشنا۔ نہ اصل مذاق زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے۔ نظم ہستی کی تکمیل کے لئے۔ دنیا میں زندگی کا تموج پیدا کرنے کے واسطے اکسیر کا نسخہ درکار تھا۔ نسخہ کہاں تھا۔ اس کے دستیاب ہونے میں

کیا دقتیں تھیں اور کس طرح ملا۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوگا۔

سنا ہے عالم بالا پہ کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کے خاک پا میں بڑھ کر ساغر جم سے
لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے
نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخہ کو بڑھ کر جانتا تھا اسم اعظم سے
بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعی پیہم سے
پھرایا فکر اجزائے اسے میدان امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شے بارگاہِ حق کے محرم سے

عالم بالا کے کیمیاگر نے وہ نسخہ عرش پر تاڑا۔ اور زبردست ملکوتی صفت قبیلوں کے مقابلہ میں تسبیح خوانی کے سلسلہ سے سعی پیہم کی بدولت نسخہ حاصل کر لیا اور میدان امکان میں تگ و دو کر کے اجزائے نسخہ بہم پہنچائے۔ نسخہ کے اجزا کیا تھے ذیل میں بالتفصیل بیان کر دئیے گئے ہیں اور اس مجموعہ اجزاء کا نام محبت رکھا گیا ہے

چمک تارے سے مانگی۔ چاند سے داغ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریمؑ سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

یہ تھی وہ بیش بہا چیز جس کے بغیر دنیا بے حس و حرکت اور بیکار پڑی تھی۔ اور یہی تھا وہ اکسیر حیات کا نسخہ جو پہنائے عالم میں مذاقِ زندگی پیدا کرنے کا کفیل تھا۔

مہوس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا
گرہ کھولی ہنر نے اس کے گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا
گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

شاعر کے تخیل کی بلند پروازی دیکھیے۔ کہ کس خوبی اور ادا سے پیغامِ عمل دیا ہے ادھر مسلمانوں کی قوم حسن و عشق کی دلدادہ محبت کے نشہ میں سرشار۔ خوابِ غفلت میں سو رہی ہے۔ اُدھر شاعر سمجھتا ہے۔ اور خوب سمجھتا ہے۔ کہ محبت بہترین قوت عاملہ ہے۔ اور اسی کی چاٹ سے مسلمانوں کو۔ ان محبت کے شیدائیوں کو۔ میدانِ عمل میں لے جانے پر کمربستہ ہے۔ عجب لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ محبت زندگی ہے۔ یہ محبت محض تیرگی اور داغ جگر نہیں۔ بجلی کی تڑپ اور انفاس مسیحائی کی حرارت بھی اس کے اجزاء ضروری ہیں۔ حرارت جو خود گرم رہے۔ اور دوسروں کو گرما دے۔ اس میں تارے کی چمک ہو۔ حور کی پاکیزگی ہو۔ عاجزی و افتادگی کے ساتھ بے نیازی کی شان بھی لئے ہو اور سب سے بڑھ کر حیات ابدی اس

کے ہمکنار نہیں ہو۔ یہ ہے نسخہ اکسیر جو فضائے عالم میں حیات کی لہریں پھیلا رہا ہے۔ اور یہی ہے وہ نسخہ جس سے شاعر ہمیں زندگی کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے ہمیں بتایا گیا ہے۔ جذب باہم ہی زندگی ہے۔ اگر جذب باہم نہیں زندگی نہیں۔

قوم مذہب سے ہے۔ مذہب جو نہیں۔ تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اور زندگی کے آثار جنبش و خرام ہیں۔ اور حصول زندگی کے لئے سعی پیہم درکار ہے سکون موت ہے۔ اور جو افراد یا قومیں سکون کی دلدادہ ہیں زندہ نہیں۔ اور نظام ہستی میں ان کا عدم وجود برابر ہے۔

اسی رنگ میں ایک اور تصویر بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ تصویر کا نام عشق اور موت ہے۔ زبان اور خیال لاجواب ہیں۔

یہ تصویر آفرینش محبت کی ہمزاد ہے۔ اور محبت کی ہستی کا دوسرا رخ دکھاتی ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے دونو تصویروں میں کوئی ایسا فرق نہیں۔ زندگی کے مرقع میں آگے پیچھے کے نقش ہیں۔ جو ایک دوسرے کے بغیر نامکمل رہ جاتے ہیں۔ عالم ہستی کا آغاز تھا۔ محبت کی سحر کاری نے دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ اور پس و پیش آثار زندگی کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

سہانی نمود جہاں کی گھڑی تھی
تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کہیں مہر کو تاج زر مل رہا تھا
عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی

سیہ پیراہن شام کو دے رہے تھے
ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی
کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے
کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو
خودی تشنہ کام مئے بیخودی تھی
اُٹھی اوّل اوّل گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی
زمیں کو تھا دعوےٰ کہ میں آسماں ہوں
مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظارہ تھا پیارا
کہ نظارگی ہو سراپا نظارا
ملک آزماتے تھے پرواز اپنی
جبینوں سے نورِ ازل آشکارا
فرشتہ تھا اک عشق تھا نام جس کا
کہ تھی رہبری اس کی سب کا سہارا
فرشتہ کہ پُتلا تھا بے تابیوں کا
ملک کا ملک اور پارے کا پارا

چلے سیرِ فردوس کو جا رہا تھا
قضا سے ملا راہ میں وہ قضا را
یہ پوچھا ترا نام کیا کام کیا ہے
نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ
اجل ہوں مرا کام ہے آشکارا
اُڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پُرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
پیامِ فنا ہے اسی کا اشارا
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اس کے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا
ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا
سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
ہنسی اس کے لب پہ ہوئی آشکارا
گری اس تبسّم کی بجلی اجل پہ
اندھیرے میں ہو نور کا کیا گزارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا کتنی شکار قضا ہو گئی وہ

آفرینش محبت میں موقع اور محل کے تناسب سے بیان میں متانت اور ثقاہت نمودار ہے۔ موجوداتِ عالم بے حس و حرکت ہیں۔ چاروں طرف سکوت اور خاموشی طاری ہے۔ ایک مہتم بالشان واقعہ آفرینش محبت کا درپیش ہے۔ الفاظ۔ فقرات بھاری بھرکم نظر آتے ہیں اور خیالات بھی سوچ سوچ کر قدم رکھتے ہیں۔ معاملہ کی اہمیت خود ذکر معاملہ میں دکھائی دے رہی ہے۔

عشق اور موت میں کیف زندگی کے اولین جذبات ہیں۔ حیات کی جدید اور لذیذ کیفیتیں۔ ایک انوکھے اور دلچسپ پیرایہ میں نئی نئی جلوہ آرائیاں نئی ادائیں۔ نئے کرشمے۔ نئے انداز۔ نئی تڑپ اور نئی تپش۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلبلاہٹ اور سبک سیری کے نظارے دکھا رہے ہیں۔ اور اس کے طرز بیان میں بھی وہی روانی اور وہی شوخی ہے۔ جو ہمیشہ نو دولتی کی ہر ایک حرکت میں پائی جاتی ہے یہاں الفاظ۔ فقرات ہلکے پھلکے۔ لطافت اور نزاکت کے پتلے۔ زمین شعر میں چوکڑیاں بھرتے نظر آتے ہیں۔ عشق و محبت کی بے قراری نظم میں نمایاں ہے۔ محبت کی آبیاریوں سے پیارے پیارے شگوفے کھل رہے ہیں کلی پھوٹ رہی ہے۔ شبنم رو رہی ہے۔ پھول ہنس رہے ہیں۔ پروانہ کی تڑپ۔ شمع کی دلسوزی۔ حسن و عشق کی گرم بازاری کے جلوے جابجا نظر آ رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے قضا نمودار ہوتی ہے۔ اور اپنے تباہی خیز کارناموں پر فخر و مباہات کر رہی ہے۔ کہ محبت کے لبوں پر ہنسی آتے ہی آفتاب را

ہوئی۔ پھر کیا تھا قضا پر بجلی گری۔ اور

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

کیا ہی خوب اشعار ہیں۔

دونو تصویریں کیا بلحاظ تخیل اور کیا بلحاظ طرزِ بیان فنِ شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ان کے بار بار پڑھنے میں ایک لطف حاصل ہوتا ہے۔ جو احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

اردو اور اہلِ پنجاب

قریباً بیس پچیس سال کا عرصہ ہوا ہے کہ اہلِ پنجاب کی اردو پر بڑی لے دے ہوئی۔ ناظر (چودھری خوشی محمد صاحب) اور اقبال کی نظمیں بالخصوص زیرِ بحث تھیں۔ خود اقبال نے ان دنوں میں ہی ایک صاحب "تنقید ہمدرد" کے مضمون کا جواب لکھا۔ اور ہم اس جواب میں سے اقتباس کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

"ہمارے دوست "تنقید ہمدرد" اس بات پر مصر ہیں۔ کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے۔ کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے۔ جو زبان ہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو۔ اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس سے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں۔ اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدمِ صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ اردو زبان جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں

تک محدود تھی۔ مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا۔ اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا۔ اور کیا تعجب ہے۔ کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جاتے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں۔ کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت۔ ان کے تمدنی حالات۔ اور ان کا طرز بیان۔ اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں۔ کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے تعجب ہے۔ کہ بیز۔ کمرہ۔ کچہری۔ نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُر معنے پنجابی لفظ استعمال کر دے۔ تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے۔ کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنے پنجابی کا لفظ اردو میں نہ گھسنے پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے۔ جو علم زبان کے اصولوں کی صریح مخالف ہے۔ اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرے۔ تو آپ کا عذر بیجا ہوگا۔ اردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ۔ بدمعاش۔ بازار۔ چالان وغیرہ وغیرہ لئے ہیں۔ اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک زمانہ نے کئی پہلو بدلے۔ دنیا میں کئی تغیرات ہوئے۔ ہند میں اور نوآورد معاشری

ادبی۔ انقلابات نے۔ ہمارے معاشرت کے معیار۔ ادبیات اور اس کے مصائب و محاسن کے نظریئے تبدیل کر دئے۔ اس عرصہ میں اقبال نے تبحر علمی۔ وسعت نظر۔ احساس واقعات۔ اور مشق فن سے۔ دور دور تک ملک سخنوری میں فتوحات کی ہیں۔ جن کے سامنے "تنقید ہمدرد" کبھی خراج تحسین ادا کرنے سے گریز نہیں کر سکتی۔

اس کے الفاظ موزون۔ ترکیبیں لطیف۔ بندشیں دلآویز اور مضمون آفرینیاں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ بلندی خیال اور شستگی زبان تسخیر کا اثر رکھتی ہیں۔ اور کلام کی برجستگی اور پختگی اس کی مہروری کی شاہد ہیں۔ شعر زبان پر آیا تو نطق زبان کے بوسے لیتا ہے۔ اور زبان بیان کا منہ چومتی ہے۔ قدسی صفات خیال آسمان سے زمین پر آتا ہے۔ اور زمین پر رہنے والوں کو اپنے فلک پیما بازوؤں پر اڑا کر عرش کے راز دکھا دیتا ہے۔ شاعری کیا ہے۔ جادوگری ہے۔ الفاظ کی لطیف بندش اور خیالات کی دلفریب نزاکت سے۔ ایک لحظہ کے لئے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ اور حیرت و استعجاب کا تسلط ہو جاتا ہے۔ اور پھر جذبات ملی کا جو مقصد شاعر ہے۔ دل میں ایک دریا امنڈ آتا ہے اشعار پڑھے جا رہے ہیں۔ ہم کچھ سمجھتے ہیں۔ کچھ نہیں سمجھتے۔ لطف اٹھا رہے ہیں۔ مزے لے رہے ہیں۔ دل ابھرتا ہے۔ دماغ سوچنے لگتا ہے اور سارے بدن میں ایک سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو برقی اثر نغموں نے چاروں طرف پھیلا دی ہے۔ سننے والے اور سنانے والے پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کر سکے۔ اور قلم میں زور نہیں کہ لکھ سکے "تنقید ہمدرد" کے بعد کئی احباب

نے اقبال اور اس کے کلام پر تبصرے لکھے۔ ان میں سے ہم یہاں صرف مولانا اسلم جیراجپوری کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"ذوق صحیح جذبات عالیہ کی ان لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے جن سے دل کے تار بجتے ہیں۔ یہی سبب ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب (اقبال) کی شاعری اہل فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذّت کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ علوم دینی و دنیوی۔ مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں۔ ذوق صحیح۔ دل درد مند۔ اور طلاقت لسانی رکھتے ہیں۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ہے۔ اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے سے زمین سے آسمان تک کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں۔ مرغان اولی اجنحہ کے ساتھ اُڑتے ہیں۔ ساکنان حرم قدس سے ملتے ہیں۔ بزم انجم و کواکب کے رموز سنتے ہیں۔ شبنم اور آفتاب کے باہمی راز۔ گل و بلبل کے ناز و نیاز اور پروانہ و شمع کے سوز و ساز سے آشنا ہیں۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں، سمندروں کی موجیں، سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں۔ قطرۂ اشک میں سوزش دل کا تب و تاب اور دانۂ گوہر میں حیات معنوی کی آب دیکھتے ہیں۔ غرض عالمستان معنی ہے جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے جواہر پارے چنتے ہیں۔ اور جذبات طیبہ اور دینیہ کا پیکرستان تیار کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ اس قدر تیز ہیں ہے۔ کہ ایک ہی چیز پر نہیں رکتی۔ بلکہ نتائج سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر اردو ہے لیکن اس میں انتہائی

لطافت اور انتہائی ایجاز ہے یعنی فصاحت لفظی اور بلاغت معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے۔ جو مضمون ہے۔ وہ نہایت صاف ۔ برجستہ ۔ اور نکتہ سنجی ۔ اور ندرت خیال کا بہترین نمونہ ہے ۔ انداز بیان اور طرز ادا انوکھا اور دلکش ہے ۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے ۔ صنائع و بدائع تشبیہات و استعارات کے پیچ میں وہ نہیں پڑتے ۔ لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ ان کا جام شاعری اس سوگواری کی تلخی سے پاک ہے ۔ جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے ۔ وہ ماضی کے ساتھی نہیں ہیں ۔ بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں ۔ ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے ۔ جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی ۔ بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے ۔ وہ اپنی شاعری سے ملت جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں ۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے اپنی شیوا بیانیوں سے قومی ادبیات میں ایک نئی روح پھونک دی ہے ۔ ہم تو کلام اقبال کی صورت ظاہری کے شیدائی و دلدادہ ہیں مگر معنوی محاسن کے لحاظ سے اقبال کا پایہ شاعری میں بلند سے بہت بلند ہے ۔ اس نے ملی اور سیاسی مضامین حسن و عشق کی زبان میں ادا کرکے چشم بینا اور گوش شنوا کے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش کے دروازے کھول دیئے ہیں ۔ اقبال ابراہیمی عقیدت اور اسلامی اخوت کی سحر کاریوں کا شیدائی ہے ۔ اور قوم و ملت میں بلکہ سارے عالم میں اسی عقیدت اور اسی اخوت کی جلوہ آرائیاں دیکھنے کا تمنائی ۔ اس کی شاعری کا یہی اصل اصول ہے ۔ اور اس کی نغمہ پیرائیوں کا یہی مقصد اور مدعا ہے ۔

حسن و عشق کا دلربایانہ طرزِ بیان۔ اور رنگ و آب شاعری کا دیدہ فریب انداز اس کے لئے مایۂ ناز نہیں۔ وہ حقیقت کو صورتِ ظاہری پر ترجیح دیتا ہے۔ اور سچ پوچھو تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ صورت کا حقیقت سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ لیکن ہوس بازی اور ظاہر پرستی ہند کی شاعری کا شعار رہا ہے۔ اور اس کے مشتاق ظاہری زیب و زینت پر فریفتہ ہو جاتے رہیں۔ اور حسنِ باطن کی طرف متوجہ ہونے کے لئے کچھ ایسے تیار نہیں۔ تاقبال کا تو خیال ہے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تیری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

اقبال اور ابنائے وطن

اقبال کو ابنائے وطن سے شکایت ہے۔ اس کی شاعری پر نکتہ چینیوں کی نہیں۔ بلکہ اس کے مضامین کلام سے بے التفاتی کی۔ مضامین جو اسلامی ہمدردی و دنیائے اسلام پر غور و فکر کے لئے موزوں کئے گئے ہیں۔ مضامین جو اسلامیوں کو قعرِ ذلت سے اٹھا کر اقوامِ عالم میں مسندِ عزت پر بٹھانے کے کفیل نظر آتے ہیں۔ شکایت پیامِ مشرق کے دیباچہ میں لکھی گئی ہے فارسی دان اصحاب خود اندازہ کر لیں گے کہ شکایت کس لطافت سے ادا کی گئی ہے۔ اور کہاں تک بجا ہے۔

آشنائے من ز من بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوهِ خسروی او را دہم
تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من
رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید
فطرتِ من عشق را در بر گرفت
صحبتِ خاشاک و آتش در گرفت
حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود
نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود
برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است
مصرعِ من قطرۂ خونِ من است
تا نہ پنداری سخن دیوانگیست
از کمالِ ایں جنوں فرزانگیست
از ہنر سرمایہ دارم کردہ اند
در دیارِ ہند خوارم کردہ اند
لالہ و گل از نوایم بے نصیب
طائرم در گلستانِ خود غریب
بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است

باہتمام چودھری محمد لئیق خان منیجر
اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں چھپا

سرگذشت الفاظ

مؤلفہ

مولوی احمد دین بی اے ایڈووکیٹ لاہور

الفاظ کی کہانی - اُنکی اپنی زبانی

نازک خیالی کی جلوہ آرائیاں۔ اخلاقی ترقی و تنزل

تاریخی انقلابات - مترادفات کی تمیز و تفریق

اور نووارِدوں کے دلچسپ تذکرے

دیکھنے اور سننے کے قابل ہیں

مشاہیر اہلِ قلم اور مقتدر اخبارات نے قدر دانی کے الفاظ میں ذکر کیا ہے

اور

پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم نے ۱۹۲۳ء میں صوبہ کی بہترین تصنیف قرار دیکر

ساڑھے سات سو روپیہ کا گرانقدر انعام عطا فرمایا ہے

اور ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب نے سوا تین سو کتابیں مدارس صوبہ کے کتبخانوں کیلئے خرید ہیں

لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۶ - بلا محصولڈاک

ملنے کا پتہ :- مصنف کتاب